فقہ اسلامی اور عصر جدید

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

ناشر

المعہد العالی للقضاء والافتاء

دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

نام کتاب : فقہ اسلامی اور عصر جدید

نام مؤلف : مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

صفحات :

طبع اول : ربیع الاول ۱۴۳۰ھ مطابق مارچ ۲۰۰۹ء

کمپوزنگ : احرار الہدیٰ شمس ندوی

قیمت :

ناشر

المعہد العالی للقضاء والافتاء

دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

ملنے کا پتہ

- مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، پوسٹ باکس نمبر ۱۱۹، لکھنؤ
- مکتبۂ ندویہ، ندوۃ العلماء، لکھنؤ
- مکتبۂ اسلام، گوئن روڈ، امین آباد، لکھنؤ

فہرست

عہد اول میں اجتہاد کی تاریخی حیثیت

فقہی اختلافات کی حقیقت اور حیثیت

جدید مسائل کا حل اور علماء کی ذمہ داریاں

فتویٰ کی نزاکت اور مفتی کی ذمہ داریاں

موجودہ حالات کے مقابلہ کیلئے علم میں رسوخ اور مطالعہ میں وسعت کی ضرورت

مسلم اور غیر مسلم تعلقات اور امن عالم

مروجہ سودی نظام اور اسلامی تعلیمات

اسلامی شریعت پر عمل ہندوستان میں

مقدمہ

از: مولانا ڈاکٹر علی احمد ندوی
(مشیر عالمی فقہ اکیڈمی، جدہ سعودی عرب)

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين وخاتم النبيين سيدنا محمد وعلى آله وصحبه أجمعين وبعد!

یہ میرے لئے بڑی عزت وشرف کی بات ہے کہ مجھے استاذی الجلیل حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کے فقہی موضوعات سے متعلق فکری مضامین کے اہم ترین مجموعہ "اضواء على الفقه الاسلامى ومكانة الإجتهاد منه" کے لئے تعارفی سطریں تحریر کرنے کی سعات حاصل ہورہی ہے، استاذی الجلیل کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں، علمی وادبی حلقوں میں وہ نصف صدی سے زائد عرصہ سے اپنی فکر انگیز تحریروں کے ذریعہ معروف ہیں خصوصاً ندوۃ العلماء سے نکلنے والے عربی مجلّہ "البعث الاسلامی" اور عربی جریدہ "الرائد" کے ذریعہ اور ملکی وبین الاقوامی سطح پر خصوصاً عالم عربی میں علمی وادبی سیمیناروں وکانفرنسوں میں شرکت ومساہمت، تعلیم وتربیت اور اسلامی تاریخ کی ثقافت وجغرافیہ سے متعلق اپنی گراں قدر تصنیفات کے ذریعہ ایک ممتاز عالم ومفکر کی حیثیت سے

معروف ہیں، اس وقت وہ اپنے بلند علمی اور فکری مقام رکھنے کے ساتھ ملی قیادت کا فریضہ بھی انجام دے رہے ہیں اور دینی وملی اور علمی اداروں کی سرپرستی فرمارہے ہیں، اس وقت وہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم، آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے صدر، رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے رکن تاسیسی ہیں اور جہاں تک راقم الحروف کا تعلق ہے تو اس کو حضرۃ الاستاذ کی رہنمائی و سرپرستی اپنے تعلیمی مرحلہ کے آغاز سے ہی حاصل رہی، جب وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں حصول تعلیم کے لئے داخل ہوا تھا اور اس بات کو تیس سال سے زائد ایام کا عرصہ گزر چکا ہے کہ انہوں نے میرے دل ودماغ میں علم کا شوق پیدا کیا اور وہ محبت وشفقت دی اور ایسا سلوک وبرتاؤ کیا جس میں وہ اپنی مثال آپ ہیں، بلا مبالغہ وہ ایک بڑے ہی کریم النفس اور موروثی صفات وکمالات سے آراستہ وپیراستہ ہستی ہیں۔ ذلك من فضل الله تعالىٰ

مجھے وہ زمانہ بار بار یاد آتا ہے جب میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں طالب علم تھا اور ملک بھر سے طالبین علوم نبوت دارالعلوم کا قصد کررہے تھے، حضرۃ الاستاذ کو ان کے شاگردوں کے درمیان ایک محبوب وہردلعزیز شخصیت کے طور پر دیکھتا تھا، دارالعلوم کے دارالاقامے ہوں یا میدان، طلباء پروانہ وار ان پر ٹوٹتے وہ سب کے مسائل سنتے اور ان کا حل نکالتے اور کسی سے بھی بے توجہی نہ برتتے، سبھی کو مفید مشوروں سے نوازتے، اور رہنمائی فرماتے، مجھ پر ان کی خصوصی عنایت وتوجہ رہی اور استفادہ کا خاصہ موقع ملا، چنانچہ حضرۃ الاستاذ کے مشورے سے میں نے ”ادب الکاتب للامام ابن قتيبـه الدينوری (م:۲۷٦ھ)“ کا مطالعہ کیا، اس سے بڑا لغوی وادبی فائدہ حاصل ہوا اور لغوی فروق ذہن نشین ہوگئے۔

اس کتاب کے مطالعہ کی تاکید کے ساتھ بعض دیگر کتابوں کے مطالعہ کی طرف بھی توجہ دلائی جو قصہ نگاری کے خوبصورت اسلوب پر لکھی گئی ہیں، اور جو ادبی ذوق کو جلاء بخشتی

ہیں۔انہوں نے درجہ میں امام نووی کی تصنیف کردہ حدیث کی مشہور ومقبول عام کتاب "ریاض الصالحین" کا درس دیا،اور جب ہم لوگ ان کے خالِ معظم اور ہم سب کے مخدوم وبزرگ اور مربی سرپرست حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ان کے وطن تکیہ دائرہ حضرت شاہ علم اللہ رائے بریلی میں مقیم تھے تو حضرۃ الاستاذ سے علامہ احمد حملاوی مصری (م:۱۳۵۱ھ) کی کتاب "شذا العرف فی فن الصرف" میں بھی استفادہ کیا۔

جہاں تک مسئلہ اس مختصر سی کتاب کا ہے تو وہ آپ کے ان افکار کی نمائندگی کرتی ہے جن کا تعلق فقہی اجتہاد سے ہے، اور آپ نے خاص کر ہندوستان کی دینی جامعات میں تعلیم حاصل کررہے، طلباء سے دیرینہ روابط کی بنا پر محسوس کیا کہ اس خلا کو پاٹنے کی شدید ضرورت ہے، جو ہماری موجودہ دنیا کے بدلتے حالات اور تیز رفتار تبدیلیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اجتہاد سے گریز کی صورت میں پیدا ہوا، اکثر وبیشتر ان مسائل اور ان کے مناسب حل پر غور کرنے پر توجہ نہیں دی جاتی ہے، آپ کے اس میں دردمندانہ احساس نے نہ صرف آپ کو اس پر آمادہ کیا کہ آپ اپنی آراء کا برملا اظہار کریں بلکہ مصنف نے متعدد ان مسائل کی مثالیں بھی دیں، جو اجتہاد کی متقاضی ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ آپ کے یہ فقہی آراء وافکار آپ کی وسعت نظر اور گہرائی مطالعہ کا ایک نمونہ ہیں۔

یہ اشارہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف اپنے ان مقالات میں موجودہ دور کے مسائل میں سے کسی خاص مسئلہ پر غور وفکر کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ہر زمانہ میں اجتہاد کی اہمیت کو اجاگر کیا اور چاروں مذاہب فقہی کی اجتہادی بنیادوں کو نمایاں کیا، نیز اپنے اکثر مقالات میں مسلمانوں کے درمیان سے مسلکی اختلافات کو دور کرنے کی کوشش اور طلباء

محققین کو متوجہ کیا کہ وہ ان اسالیب سے اجتناب کریں جو جھگڑوں کا سبب ہوتے ہیں اور سیدھے سادے لوگوں کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا کرتے ہیں، جن کی بنیاد صرف مسائل فقہ میں نقطۂ نظر کا اختلاف ہوا کرتا ہے اور یہ حالات بسا اوقات موجودہ صورت حال میں جہاں عصبیت کا دور دورہ ہے، دشمنان اسلام کو جہاں کہیں موقع ملتا ہے وہ مسلمانوں اور اسلام پر جارحانہ حملہ کر رہے ہیں۔

اور یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مصنف نے آخری مقالہ موجودہ دور کے سودی نظام پر تفصیل کے ساتھ قلمبند کیا، جس میں آپ نے ساری آسمانی ادیان میں سود کی حرمت ثابت کی، اور سود کی سماجی واقتصادی مضرتوں اور نقصانات کا تذکرہ کرتے ہوئے بجاطور پر فرمایا "أفضل العلاج لداء الربا هو تشجيع القرض الحسن و التجارة بالمضاربة" (سود کی لعنت کا بہترین علاج قرض حسنہ اور مضاربت کو ترویج دینا ہے)۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ حضرۃ الاستاذ کی اس تصنیف لطیف کو قبولیت سے نوازے اور اس کو اپنی رضا کا سبب بنائے۔

علی احمد ندوی

جدہ، سعودی عرب

۱/۱۱/۱۴۲۴ھ

ترجمہ از عربی

دیباچہ

(طبع عربی)

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على
سيد المرسلين وخاتم النبيين سيدنا محمد
وعلى اٰله وصحبه أجمعين وبعد!

تفقہ فی الدین وہ حقیقت ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اہتمام کے ساتھ قرآن پاک میں تذکرہ کیا اور اس کی اہمیت بیان کی، اور اس پر پوری توجہ کا حکم بھی دیا، ارشاد ہے:

"وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ (سورہ توبة:۱۲۲)

اور مومنوں کو نہ چاہئے کہ (آئندہ) سب کے سب نکل کھڑے ہوں سو یہ کیوں نہ ہو کہ ہر گھروں میں ایک حصہ نکل کھڑا ہوا، تا کہ (یہ باقی لوگ) دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرتے رہیں اور تا کہ یہ اپنی قوم والوں کو جب وہ ان کے پاس واپس آجائیں ڈراتے رہیں، عجب کیا کہ وہ محتاط رہیں۔

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"من يرد الله به خيراً يفقه في الدين"

مذکورہ اقتباس سے اسلام میں تفقہ کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے، کیوں کہ اسلام ایسا دین ہے جس میں عقل کے استعمال کی تعلیم دی گئی ہے اور انسانی زندگی کے مسائل میں حسن وقبح کے پہلوؤں پر تفکر وتدبر کی دعوت دی گئی ہے۔

صحابہ رسول رضی اللہ عنہم جب کسی حکم شرعی کو کتاب وسنت کے سرچشمہ میں نہ پاتے تو پھر وہ غور وفکر سے کام لیتے اور اپنے تفقہ وتدبر سے عمومی احکام تک پہونچتے کیوں کہ ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد تھا جس میں وہ فرماتا ہے:

"اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا"

(سورہ محمد: ۲٤)

ترجمہ: کیا دھیان نہیں کرتے قرآن میں یا دلوں پر لگ رہے ہیں ان کے قفل۔

اور ارشاد فرماتا ہے:

اِذَا ذُکِّرُوْا بِآیَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْهَا صُمًّا وَعُمْیَاناً

(سورہ فرقان: ۷۳)

ترجمہ: اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ جب انہیں نصیحت کی جاتی ہے ان کے پروردگار کی آیات کے ذریعہ تو پھر یہ ان پر اندھے بہرے ہو کر نہیں گرتے۔

چنانچہ شریعت اسلامی کتاب وسنت سے استفادہ کے بعد مقاصد شریعت میں غور وفکر کے ذریعہ صحیح احکام تک پہونچنے کی کوشش ہمیشہ سے کرتی رہی، اور فقہاء تفقہ کی نگاہ سے پیش آنے والے مسائل پر غور کرتے رہے اور ان کا مطالعہ کتاب وسنت میں ان کے نظائر کی روشنی میں کرتے رہے۔ اس طرح علمائے دین اپنی ان تفقہ وتدبر کی صلاحیتوں کی بنیاد پر اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے رہے اور انہوں نے فہم وفراست اور روایت ودرایت کے ذریعہ ان احکام کا استنباط کیا جو صراحۃً کتاب وسنت میں مذکور نہیں تھے، اور ان کی ضرورت ان کو زندگی کی وسعتوں اور عرب کی سادگی سے نئے حدود وآفاق میں

مسلمانوں کے پہنچ جانے کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے اور راسخ العلم علماء نے جو اجتہاد کی صلاحیت بھی رکھتے اور اس دین کی روح سے واقفیت بھی رکھتے، نت نئے مسائل کا حل دین اسلامی کی روشنی میں پیش کیا اور اس طرح انہوں نے شریعت اسلامی کے مآخذ کو سامنے رکھتے ہوئے احکام شریعت کی تدوین کی جس کی نظیر کسی دوسرے مذہب میں ملنی ممکن نہیں، واقعہ یہ ہے کہ ایک عظیم الشان علمی وفقہی محنت تھی۔

بیشک وہ احکام جو صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے منقول ہیں انہوں نے ان کا مشاہدہ حضور اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ میں کیا تھا اور ان احکام میں بسا اوقات کچھ اختلافات بھی واقع ہوئے تھے جن کا سبب اس وقت کے حالات یا صحابہ کا اپنا علم ہوتا یعنی آپ ﷺ نے کسی خاص سیاق میں کوئی خاص حکم دیا ہو اور صحابی رسول ﷺ نے اس کو تذکرہ اپنے انداز میں کردیا جس سے یہ اختلاف رونما ہوا، ان اختلافات کے ازالہ کے لئے اور آپ ﷺ کے ارشادات کی حکمت معلوم کرنے کے لئے علماء کی کوششیں شروع ہوئیں جو دین کے بنیادی احکام میں نہ تھیں بلکہ فروعی اور جزوی احکام میں تھیں، یہ اختلاف حق پر مبنی تھے، اور کتاب وسنت تک پہونچنے کی کوشش میں تھے نیز ان اکابر علماء کی دیانتداری اور اخلاص کا مظہر تھے، جس کی وجہ سے علمائے امت کا یہ اتفاق ہوگیا کہ یہ فقہی مسالک اختلافات کے باوجود دین حق پر ہیں۔

مسلمانوں میں مقبولیت حاصل کرنے والے چار بڑے فقہی مسالک ہیں، اگرچہ کہ کچھ اور فقہی نظریات بھی پائے جاتے ہیں جو انہی مسالک کی شاخیں ہیں اور کچھ اہل حق ان کے مطابق عمل بھی کرتے ہیں۔

یہ چاروں بڑے مسالک مختلف ممالک واقوام میں ان علاقوں اور وہاں کے باشندوں کی ضروریات کی وجہ سے پھیلتے چلے گئے، اللہ تعالیٰ نے ان مسالک میں جو سہولت کا پہلو مضمر فرمایا تھا اور فقہاء نے جس کو نمایاں کیا یہ بھی ان مسالک کی اشاعت کا سبب بنا۔

واقعہ یہ ہے کہ اجتہاد اور استنباط احکام کی کوششیں جو اسلام کے سرچشمہ سے استفادہ کرتے ہوئے کی گئیں اور جن میں اگرچہ کہ بعض فروعی اور جزوی نوعیت کے اختلافات ظاہر ہوئے یہ کوشش اسلام کی عظمتوں کی منھ بولتی تصویر ہے اور اسلام کی کاملیت وجامعیت کا مظہر ہے، نیز انسان کی ضرورتوں کی رعایت کا نتیجہ بھی ہے، یہی وہ کوششیں ہیں جس نے اسلام کو دیگر ادیان میں ممتاز اور نمایاں کردیا اور اس دین کے ذریعہ سے اللہ کی آخری نعمت کی تکمیل کردی۔

اس استنباط کے عمل کی ایک عظیم تاریخ رہی ہے، جو اجتہاد سے عبارت رہی، اجتہاد کے اصول وضوابط ہیں جن کو فقہائے امت نے کتاب وسنت سے اخذ کرتے ہوئے بیان کیا، یہ وہ اصول ہیں جن کو صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور اکرم ﷺ کی زندگی میں پایا اور جن کو انہوں نے خود اپنی زندگیوں میں برتا، اور اس طور پر اجتہاد کے اصول نمایاں ہوگئے کہ بعد والے علماء ان کو اپناتے ہوئے غلطیوں سے محفوظ ہوگئے، اس طرح سے یہ دین قدیم وجدید ایک ہی وقت میں قرار پایا، جس میں پچھلے اصول بھی برقرار رہے، اور نت نئے مسائل کا حل بھی نکل آیا۔ اس خصوصیت کو متعدد اہل علم حضرات نے محسوس کرتے ہوئے بیان بھی کیا۔

فقہ اسلامی سے متعلق موضوعات پر علمی سیمیناروں میں میری شرکت مجھے اس موضوع پر لکھنے میں آمادہ کرتی رہی۔ چنانچہ میں نے اس ذیل میں متعدد مقالات قلمبند کیے جن میں سے بیشتر مختلف مجلّات میں چھپتے رہے ہیں، اسی میں میرا ایک مقالہ جو اجتہاد اور اس کی تاریخ پر مشتمل ہے، جس کو میں نے الجزائر کی ایک بڑی کانفرنس میں پیش کیا تھا وہ بھی شامل ہے، پھر بعض مقالات جو فقہی مسالک کے اختلاف اور حالات کے تقاضوں سے فقہ اسلامی کی مناسبت سے موضوع ہیں وہ بھی شامل ہیں۔ بعض مقالات جو میں نے اردو میں لکھے تھے ان کا ترجمہ میرے بعض رفقاء نے کیا جن میں قابل ذکر مولوی اقبال احمد ندوی غازی پوری، اور مولوی آفتاب عالم ندوی دھنبادی اساتذہ دارالعلوم ندوۃ العلماء قابل ذکر ہیں۔

میں ان عزیزوں کا بھی شکرگزار ہوں جنہوں نے ان مقالات کو جمع کر کے نشر واشاعت کے لئے پیش کیا، یہ ایک چھوٹی سی کوشش ہے جس سے شاید علوم اسلامیہ کے طلباء فائدہ اٹھائیں۔ میں عزیز محترم ڈاکٹر مولانا علی احمد ندوی سلمہ اللہ وبارک فیہ کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے ان مقالات پر توجہ دی اور ایک ایسا مقدمہ لکھا جو اس مجموعہ کی علمی اہمیت کو بڑھاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس کوشش پر انہیں جزائے خیر عطا فرمائے اور انہیں بڑی علمی ودینی ترقیات سے نوازے، اللہ تبارک وتعالیٰ سے یہ بھی دعا ہے کہ وہ اس خدمت کو قبول فرمائے۔ واللہ الموفق وعلیہ التکلان

۵/۵/۱۴۲۴ھ — محمد رابع حسنی ندوی

۴/۷/۲۰۰۳ء — دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

دیباچہ

(طبع اردو)

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید
المرسلین وخاتم النبیین سیدنا محمد بن عبداللّٰہ
الصادق الأمین وعلی آلہ وصحبہ وعلیٰ من تبعھم ودعا
بدعوتھم إلیٰ یوم الدین أمابعد!

عالمی سطح پر اس وقت جو علمی دور ہے وہ وسائل اور علاقوں کی آپسی قربت کی وجہ سے ایک دوسرے سے بہت مربوط نظام کا حامل دور بن گیا ہے، قدیم عہد میں علاقوں میں جو علاحدگی تھی اور ہر علاقہ اپنے اصول ورواج کے دائرے ہی میں رہتا تھا، وہ اب عالمی ارتباط اور تقارب میں بدل گیا ہے اور ہمیں حضور اکرم ﷺ کی بعثت میں اس بات کی رعایت بھی نظر آتی ہے کہ آپ ؐ کی لائی ہوئی شریعت اور دین چند علاقوں تک یا چند آبادیوں تک محدود نہیں رکھا گیا، بلکہ اس میں پورے عالم اور سارے طبقات کی رعایت رکھی گئی ہے، ہمارے مذاہب فقہیہ کو گہرائی سے دیکھا جائے تو ان میں بھی اس کی جھلک نظر آتی ہے، دنیا کی موجودہ صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے مذاہب فقہیہ میں بھی تقارب اور آپسی ربط ہونے کی ضرورت پیدا ہوتی ہے، جس کی طرف بھی ہمارے مذاہب فقہیہ کے ذمہ داروں کی نظر ہونی چاہئے، اس تعلق سے میں نے چند مضامین لکھے

تھے جو بعض فقہی سیمیناروں میں پیش کیے تھے جو عربی میں "أضواء علی الفقه الاسلامی ومکانة الاجتهاد منه" کے نام سے دارالقلم دمشق سے استاد محمد علی دوله نے کتابچہ کی صورت میں شائع کیا تھا اور اس پر عالمی فقہ اکیڈمی، جدہ کے مشیر خاص ڈاکٹر مولوی علی احمد ندوی (زاده الله علماً وعملاً وتوفیقاً) نے ایک مقدمہ تحریر کیا تھا جو کہ فقہ اسلامی کے محقق ومصنف ہیں اوران کوان کی فقہی خدمات پر بین الاقوامی فیصل ایوارڈ بھی مل چکا ہے، ان کے مقدمہ نے کتاب کی قیمت میں اضافہ کیا۔

عربی میں اس مجموعۂ مقالات کو دیکھ کر بعض احباب نے اردو میں بھی اس طرح کی چیز لانے کی ضرورت محسوس کی، اور ترجمہ بھی کیا اور جو مقالات اردو میں تھے ان کو بھی شامل کرلیا گیا، اس طرح ایک کتاب تیار ہوگئی جسے دارالعلوم ندوۃ العلماء کا شعبۂ افتاء وقضاء "فقہ اسلامی اور عصر جدید" کے نام سے شائع کر رہا ہے۔ مولوی منور سلطان ندوی (المعہد العالی للقضاء والافتاء، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں جنہوں نے اس کے لئے فکر کی اور عربی مضامین کو اردو میں منتقل کیا، اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے اور مزید توفیق دے۔

عزیزان ڈاکٹر مولوی سید راشد نسیم ندوی (حیدرآباد) اور مولوی سید محمود حسن حسنی ندوی سلمہما کے لئے بھی دعا ہے کہ اول الذکر نے عربی مجموعہ کے راقم کے پیش لفظ اور ثانی الذکر نے مولانا ڈاکٹر علی احمد ندوی کے مقدمہ کا ترجمہ کیا۔

اس طرح یہ کتاب ہمارے اردو داں طبقہ کے سامنے ہے امید ہے کہ یہ کوشش پسند کی جائے گی، توفیق ورہنمائی ساری کی ساری اللہ کی طرف سے ہے۔ وهو المستعان وعليه التكلان۔

محمد رابع حسنی ندوی

دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۱۰ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ

شریعت کے مقاصد اور مصالح

تمہید:

دوستو، بزرگو، اور ساتھیو!

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے میرے متعلق جو تعریفی باتیں کہی ہیں وہ محبت پرمبنی ہیں، میں یہ تو نہیں کہتا کہ وہ سب غلط ہے، میں تو یہ کہوں گا کہ انہوں نے محبت میں زائد طریقہ سے میرا تعارف کرایا، مجھے فقہ سے دلچسپی رہی ہے، میں نے اپنی تعلیم مدارس دینیہ میں اور اس کے موجودہ نصاب کے مطابق حاصل کی، اس میں فقہ کے مضمون کے سلسلہ میں اس مضمون سے دلچسپی اور مناسبت محسوس ہوتی رہی لیکن فراغت تعلیم پر تدریسی مرحلہ میں میرا میدان عمل ادب اور خاص طور سے عربی ادب رہا ہے، اور عربی ادب عربی ہونے کے تعلق سے اور شارح علیہ السلام کی زبان ہونے کی بنیاد پر یہ شریعت کے عرف اور ترجمان کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ شریعت کے موضوع سے علیحدہ نہیں ہے۔

الفاظ کا معلومات سے تعلق

وہ دین کی ترجمان اور اسلام کی زبان ہے، دین کے جو پہلو ہیں، ان کی حقیقت تک پہنچنے کا وہ ذریعہ ہے اور زبان کے سلسلہ میں بعض لوگوں نے یہ لکھا ہے اور صحیح لکھا ہے کہ الفاظ کو عام لوگ بظاہر محض الفاظ سمجھتے ہیں، حالانکہ زبان کے الفاظ محض الفاظ نہیں ہیں، ان

✦ خطبۂ صدارت: مقاصد شریعت ورکشاپ زیر اہتمام اسلامک فقہ اکیڈمی دہلی

میں ان کے معانی ومفاہیم پیوست ہیں، الفاظ ان کی ظاہری شکلیں ہیں جن سے معانی ومفاہیم حاصل ہوتے ہیں جو کہ اپنے مستعملہ الفاظ کے اندر چھپے ہوتے ہیں، ہر لفظ اپنے معنوں کا حامل ہوتا ہے، جب کوئی لفظ آدمی سیکھتا ہے اور کوئی لفظ اس کو آتا ہے تو اس کو وہ معانی بھی آجاتے ہیں جو اس لفظ کے اندر ہیں الفاظ کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے، بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن کے متنوع اور متعدد معانی ہوتے ہیں اور بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن میں کم معانی ہوتے ہیں، لیکن الفاظ بہر حال اپنے معانی کے لئے ایک طریقہ سے آئینہ ہوتے ہیں۔

قرآن مجید میں 'اسماء' کا لفظ کئی جگہ آیا ہے وہ مسمیات کے مفہوم کو ظاہر کرتا ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ لفظ درحقیقت عنوان ہوتا ہے اپنے معانی کا، مثلاً انسانوں کے نام ہوتے ہیں جیسے: خالد، تو جب یہ لفظ بولیں گے تو جس کا نام خالد ہے وہ پورے اپنی صفات کے ساتھ اور اپنی خصوصیات کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتا ہے اور یہ محض لفظ 'خالد' سے ہوتا ہے جو بامعنی لفظ ہے صرف صوت نہیں ہے۔

صوت اور لفظ میں یہی فرق ہے، صوت کے اندر معانی نہیں ہوتے، صرف اشارہ ہوتا ہے، لفظ کے اندر معانی ہوتے ہیں، اور جب کوئی شخص کسی زبان سے واقف ہوجاتا ہے اور زبان پر اس کو عبور حاصل ہوتا ہے تو وہ اس زبان کے بولنے والوں کی ثقافت سے، ان کے اخلاق سے، ان کی حیثیتوں سے اور ان کی خصوصیات سے واقف ہوجاتا ہے، کیوں کہ زبان کے الفاظ ہی میں وہ سب پنہاں ہوتے ہیں، چنانچہ عربی ادب سے جس کو تعلق ہوگا وہ عربوں کی زندگی سے واقف ہوجائے گا، ان کی خصوصیات اور ان کے مزاج سے واقف ہوجائے گا، ان کی رسموں سے، ان کی ثقافت وکلچر سے واقف ہوجائے گا، کیوں ان کے اشعار کے اندر، ان کی نثر کے اندر وہ چیزیں پنہاں ہیں، ان کے الفاظ کے ذریعہ سے یہ سب واقفیت ہوسکتی ہے۔

اسی طرح علوم کی زبان ہوتی ہے، علوم کے جو الفاظ ہیں، ان سے علوم معلوم ہوتے ہیں، ہم جب 'رفع' کا لفظ (جو ایک اصطلاح ہے) استعمال کرتے ہیں تو ہمیں نحو کا وہ قاعدہ معلوم ہو جاتا ہے جس کے مطابق رفع کا مطلب سمجھا جاتا ہے، یا لفظ 'جر' ہے، یا اور جو بھی ہے، علوم کے جو الفاظ ہیں ان سے علوم معلوم ہوتے ہیں، تو الفاظ کی بڑی حقیقت ہے، الفاظ صرف یہی نہیں کہ وہ الفاظ ہیں، جیسا کہ ہم اپنی عام زندگی میں الفاظ کے متعلق سمجھتے ہیں کہ وہ بس الفاظ ہیں، معانی گویا کہ الگ ہیں، الفاظ الگ نہیں ہیں، بلکہ دونوں بالکل ایک دوسرے میں پیوست ہیں۔ معانی الفاظ کے ساتھ بالکل پیوست ہیں، اسے علاحدہ نہیں کیا جاسکتا ہے، اسی لئے آپ دیکھئے کہ بعض الفاظ سے آدمی کی توہین ہوجاتی ہے، کیوں توہین ہوتی ہے؟ اس لفظ کے اندر وہ توہین والا مادہ ہوتا ہے کہ سنتے ہی آدمی کو اپنی توہین کا احساس ہوتا ہے، مثلاً ہم کہتے ہیں کہ فلاں میں شئ لطیف کی کمی ہے، اس شئ لطیف کی کتنی ہی تاویل کیجئے، لیکن سننے والا اس سے اپنی اہانت محسوس کرتا ہے، اس لئے کہ شئ لطیف، شئ کے ساتھ جب آپ لطیف کا لفظ لگائیں تو اس کے وہ معنی بن گئے، اور اسی طرح دوسری مثالیں اور بھی دی جاسکتی ہیں۔

میں اس تشریح کے ذریعہ یہ بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ چونکہ عربی زبان وادب سے میرا تعلق ہے، یہ میرا میدان عمل ہے، اس لئے جو ثقافتی چیزیں یا جو معلومات ان کے تحت آتی ہیں ان سے واقفیت ہوتی ہے۔ اور شاید یہ ذکر کرنا فائدہ سے خالی نہ ہو کہ عربی کے ذریعہ میں نے علوم دینیہ بھی حاصل کی اور فقہ بھی پڑھی، ہدایہ اولین تو میں نے دارالعلوم دیوبند ہی میں پڑھی، اس وقت ایک سال دارالعلوم دیوبند میں رہا تھا، مجھے اگر فقہ کا میدان ملتا تو وہ میرا بھی خاص موضوع بنتا، لیکن میں نے فقہ کو اپنا خصوصی میدان نہیں بنایا، لیکن بہر حال فقہ وہ موضوع ہے کہ جس سے ہر مسلمان کو تعلق ہے، اس سے کوئی مسلمان بچ نہیں سکتا، اس لئے کہ اگر وہ اس سے ناواقف ہے تو وہ دین پر عمل نہیں کرسکتا، اور اگر اس کو دین پر

عمل کرنا ہے تو فقہ سے واقفیت اس کے لئے ضروری ہے، چاہے بقدر ضرورت ہو، اور اگر کوئی آدمی اس کو میدان عمل بنائے تو اس سے واقفیت اور زیادہ ہو جائے گی اور عربی جاننے والے کو فقہ سے تعلق رکھنے میں کوئی مشکل بھی نہیں۔

فقہی اختلاف کیوں؟

فقہ اسلامی کے سلسلہ میں سبھی یہ جانتے ہیں کہ وہ مختلف مذاہب پر مشتمل ہے جس کے مابین اختلافات ہیں، ایسا کیوں ہے، شریعت اسلامی جیسا کہ آپ جانتے ہیں، اللہ رب العزت کی دی ہوئی ہے، جس نے انسان کو پیدا کیا، انسان کی خصوصیات اس نے متعین فرمائی، انسان کی ضروریات بھی اسی کی متعین کی ہوئی ہیں، تو وہ جانتا ہے کہ انسان کی کیا ضروریات ہیں، اور اس کی طاقت اور صلاحیت ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جو شریعت انسان کو عطا فرمائی اس میں انسان کی ضروریات وخصوصیات کی رعایت رکھی، اس لئے کہ وہ دین فطرت ہے، دین فطرت کا مطلب یہ ہے کہ فطرت کے تقاضوں کی اور فطرت کی جو دشواریاں ہیں ان کی رعایت کی گئی ہیں، ورنہ وہ دین فطرت نہیں ہوسکتا، تو شریعت جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی اور وہ قیامت تک کے لئے ہے، اور وہ حضور اکرم ﷺ کی لائی ہوئی شریعت ہے، اور آپ ﷺ آخری نبی ہیں، آپ کی شریعت آخری شریعت ہے، جو قیامت تک چلے گی، تو اس شریعت میں اختلاف کیسے، اور اگر اختلاف ہے تو اس میں کوئی مصلحت ہوگی، اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی شریعت ہے، اس میں عیب نہیں ہوسکتا، یہ اختلاف کیوں ہے؟

دراصل یہ اختلاف حقیقت میں فطرت کے مطابق ہے، اس لئے کہ انسان مزاجوں کے اعتبار سے، اپنے مقام کے اعتبار سے اور اپنے دیگر حالات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے فرق رکھتا ہے، انسان کی خصوصیات میں فرق ہوتا ہے، اس کے مزاج میں، اس کی

برداشت میں فرق ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام فرمایا، سمجھئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک انعام ہے کہ اس نے جو شریعت ہم کو دی ہے اس میں انسانوں کے حالات وضروریات کے لحاظ سے گنجائش رکھی ہے، آپ دیکھئے کہ بنی اسرائیل سے کہا گیا تھا کہ وہ گائے ذبح کریں، ان کو اس میں اختیار حاصل کیا تھا کہ اس حکم پر جس طرح عمل کرنا ان کے لئے آسان تھا کر لیتے لیکن انہوں نے بار بار سوال سے اپنے عمل کا دائرہ تنگ کر لیا، یہ گائے کیسی ہو، رنگ کیسا ہو، وہ جتنا پوچھ سکتے تھے پوچھتے چلے گئے، ان کے پوچھنے پر اللہ تعالیٰ نے دیکھا کہ وہ اپنے اوپر پابندی بڑھانا چاہ رہے ہیں، لہذا پابندیاں بڑھا دیں کہ اس طرح کرو، اس طرح کرو، پھر وہ دشواری میں پڑ گئے، ان کو وہ گائے تلاش کرنا ایک بڑی مصیبت کا باعث بن گیا، بڑی مشکل سے وہ گائے ملی، اسی لئے شریعت میں کہا گیا: 'لا تسئلوا عن أشياء إن تبدلكم تسؤكم (۱) اس لئے یہ ہدایت دی گئی کہ تم کو جو بتا دیا گیا ہے، اس سے تم اخذ کر لو، پوچھ پوچھ کر تم اپنے کو تنگی میں مبتلا مت کرو، تو میں یہ سمجھتا ہوں، آسانی پیدا کرنے کے لئے اختلاف کی گنجائش رکھی گئی، اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی رکھی گئی ہے، حضور ﷺ نے اس گنجائش کو قائم رکھا، چنانچہ مختلف معاملات میں یہ جو مختلف آراء قائم ہوئی ہیں، مختلف مذاہب بنے ہیں، یہ انسانی ضرورت اور انسانی دشواریوں سے مطابقت رکھتے ہیں۔

مختلف مسالک میں علاقوں کی مناسبت

میں نے اپنے بعض مضامین میں اس سلسلہ میں عرض کیا کہ آپ دیکھئے جو مذاہب دنیا کے مختلف علاقوں میں پھیلے ہیں، تو وہ مذاہب (مذاہب سے مراد فقہی مذاہب ہیں) آپ دیکھئے کہ ان میں اپنے اپنے علاقوں سے مناسبت ہے، یہ خاص بات ہے، مثلاً پانی ہی کو لے لیجئے، جن علاقوں میں پانی کی بہتات ہے، وہاں عام طور سے آپ کو فقہ حنفی کے ماننے

---

(۱) سورۂ مائدہ: ۱۱۰

والے ملیں گے، اور جن علاقوں میں پانی کی کمی ہے وہاں آپ کو فقہ مالکی کے ماننے والے ملیں گے، اور دونوں میں آپ دیکھئے کہ پانی کے سلسلہ میں دونوں کے مسلک الگ الگ کیا ہیں، اگر ہم اپنے علاقہ کے لحاظ سے فقہ مالکی کو دیکھیں تو فقہ مالکی کا وہ مسلک عجیب سا معلوم ہوگا، وہاں پانی کے معاملہ میں بڑا توسع ہے، جو لوگ مغرب میں گئے ہوں گے، الجزائر یا مراکش تو معلوم ہوگا کہ ان علاقوں میں پانی کے حصول میں کمی ہے۔

فقہ مالکی میں طہارت سے متعلق مسائل کے مصالح

میں اپنا واقعہ بتاتا ہوں کہ میں الجزائر گیا ہوا تھا، انہوں نے ایک شہر میں فنکشن رکھا تھا، عصر کے وقت میں وہاں پر گیا۔ میں نے نماز نہیں پڑھی تھی اور استنجاء کی بھی ضرورت تھی، میں نے کہا: مجھے وضو کرنا ہے، تو وہ مجھے ایک جگہ لے گئے، استنجاء خانہ میں نل لگا ہوا تھا اور اس کے نیچے بالٹی رکھی ہوئی تھی، اور کچھ نہیں تھا، بالٹی میں پانی بھرا تھا، اب ایک تو یہ کہ بالکل استنجاء خانہ کے سامنے پانی سے بھری بالٹی رکھی ہوئی تھی، اور ہم لوگوں کے نزدیک یہ ہے کہ اس میں چھینٹیں بھی جاسکتی ہیں، پھر پانی نکالنے کی کوئی چیز نہیں تھی، کوئی مگ، یا کوئی گلاس نہیں تھا، تو مجھے یاد آیا کہ حدیث شریف میں آتا ہے: پانی کو اچھ اچھ کر آپ ﷺ نے وضو فرمایا، پہلے اس کو ٹیڑھا کر کے اپنا دایاں ہاتھ دھولیا، اور پھر اسی سے اچھ اچھ کر پانی کو استعمال کرلیا، مجھے خیال آیا کہ ان کے یہاں اسی پر عمل ہوتا ہے، میں نے اس پر عمل کیا اور عمل ہوگیا، وہاں سے نکل کر باہر آیا اور کہا کہ مجھے وضو کرنا ہے تو ایک بالٹی بھر کر انہوں نے رکھ دی، کوئی مگ نہیں، کوئی اور دوسری چیز نہیں، تو میں نے سوچا کہ اسی پر عمل کرنا پڑے گا، چنانچہ میں نے وہی کیا کہ پہلے ہاتھ کو دھویا ٹیڑھا کر کے اور پھر وضو کیا، یہ تو میرے ساتھ پیش آیا، لیکن ان کی زندگی میں یہ چیز داخل ہے، اس طرح پانی کم بھی صرف ہوتا ہوگا۔

ایک سفر میں حضرت مولانا (سید ابوالحسن علی ندوی) کے ساتھ گیا، مولانا کو طہارت

وغیرہ کا بڑا لحاظ ہوتا تھا، مولانا نے کہا کہ یہاں غسل خانہ میں کوئی چیز نہیں ہے، کیسے پانی استعمال کریں، کہیں سے لوٹا لایا جائے یا کوئی اور چیز، تو میزبان بہت پریشان ہوئے، کہاں سے لائیں، آخر بڑی مشکل سے ایک بڑی سی چائے دانی لا کر دی، وہ رکھی گئی اور اس سے لوٹے کا کام لیا گیا، تو یوں کہنے کو تو میں اور آپ ان پر تنقید کر سکتے ہیں، لیکن نہیں، آپ دیکھئے ان کو کہ انہوں نے حدیث شریف سے اس کا استنباط کیا اور وہ استنباط صحیح ہے، کہ حضرت محمد ﷺ جب تھوڑے پانی میں کام چلا لیتے ہیں، غسل فرما لیتے ہیں تو ہم کون بڑے پاک صاف آدمی ہیں کہ ہم نہیں کر سکتے، لیکن ہم نہیں کرتے، بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نہیں کر سکتے، ایک لگن میں پانی رکھ دیا جائے اور کہا جائے کہ تم غسل کر لو تو اس کا منہ دیکھنے لگیں گے جو یہ کہے گا، لیکن حدیث شریف میں آتا ہے، اور آپ ﷺ ہی نہیں، بلکہ حضرت عائشہؓ بھی غسل کر لیتی تھیں، (۱) تو آپ دیکھئے ہمارے یہاں پانی کی بہتات ہے، آسانی ہے، لہذا طہارت کے معاملہ میں غلو پیدا ہو گیا، اور وہ مسلک ہم کو زیادہ موافق معلوم ہوا، جس میں پانی کے استعمال میں طہارت کی زیادتی اختیار کی گئی، لیکن ان کو پانی کے حصول میں وہاں دشواری ہوئی تو ان لوگوں کو وہ مسلک زیادہ موافق معلوم ہوا، جس میں پانی کی طہارت میں زیادہ توسع ہوا۔

مذاہب کے درمیان اختلاف رحمت ہے

لہذا یہ جو مذاہب کے درمیان اختلاف ہے درحقیقت یہ رحمت ہے، ورنہ اگر ہر معاملہ میں کوئی ایک پہلو بالکل متعین یا کوئی ایک چیز سب کے لئے لازمی قرار دے دی گئی ہوتی تو کیا ہوتا آپ سوچئے، آدمی کر تو لیتا، لیکن مشکل پیش آتی، اسی طرح آپ دیکھئے کہ فقہ شافعی ہے، زیادہ تر ساحلی علاقہ میں اس مسلک کو رائج دیکھیں گے، جہاں سمندر کی چیزیں استعمال کرنے کی آسانی ہے، اور فقہ شافعی میں سمندر کی چیزوں کے استعمال میں توسع ہے، جو فقہ

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الحیض، باب القدر المستحب من الماء فی غسل الجنابۃ، حدیث نمبر: ۲۵۳

حنفی میں نہیں ہے، اگر یہ مسلک وہاں نافذ کردیا جائے اوران کا مسلک ہمارے یہاں نافذ کردیا جائے تو عجیب سا معاملہ ہوتا، آسانی کم ہوتی اور 'الدین یسر' کے مطابق نہ ہوتا اور یہ مسلک بنے کیسے! اگر گنجائش نہ ہوتی تو یہ نہیں بن سکتے تھے، حقیقت یہ ہے کہ سہولت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے رسول ﷺ کے ذریعہ سے دی گئی ہے، دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ گنجائش دی گئی ہے اور جو منع کیا گیا ہے کہ 'لاتسئلوا عن أشياء إن تبدلكم تسؤ كم' (۱) میں اس سے بھی اشارہ ملتا ہے، پوچھ کر آپ اپنے لئے تنگی کیوں پیدا کریں، اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو مخفی رکھا ہے جس چیز کو چھوڑ دیا ہے ہماری سمجھ پر، اس کو متعین کر کے اپنے لئے دشواری کیوں پیدا کریں، ہم اس سے فائدہ اٹھائیں، اس لئے شریعت میں بہت سی چیزیں انسان کی سمجھ پر چھوڑی گئی ہیں، اور بہت سی چیزوں کے متعلق واضح حکم ہے، صراحت کے ساتھ حکم ہے، اور بہت سی چیزوں کو انسان کی سمجھ پر چھوڑا گیا ہے، اور وہ چیزیں وہ ہیں جو انسان کی سمجھ کے اس دائرہ میں آتی ہیں جو شریعت سے ٹکراتی نہیں ہیں، کہ جو ایسے احکام ہیں ان احکام کی فضا میں، ان کی روشنی میں انسان کی سمجھ اسی طرف جائے گی جس کو شریعت چاہتی ہے۔

شریعت میں انسانی مصالح کی رعایت

جہاں تک مقاصد کا مسئلہ ہے، تو آدمی مقاصد سے واقف ہے تو غلط راہ پر جا ہی نہیں سکتا، مقصد خود متعین کردے گا کہ آپ اس راہ پر چلئے، اس راہ سے آپ ہٹ نہیں سکتے، مجبور ہیں، اس تناظر میں یہ سیمینار بہت اہمیت رکھتا ہے، جب تک ہم مقاصد شریعت سے واقف نہیں ہوں گے، ہم شریعت کا پوری طرح تعین نہیں کرسکتے، ہم غلطی میں مبتلا ہوجائیں گے، ہمارے پاس جو نصوص ہیں اگر ان نصوص کے صرف ظاہر کو ہم دیکھ کر اور اسی

---

(۱) سورۂ مائدہ: ۱۱۰

کے دائرہ میں رہ کر فیصلہ کریں گے تو مختلف ایسے پہلو ملیں گے جہاں ہمیں دشواری ہو جائے گی، وہاں وہ نصوص منطبق ہوتے نہیں معلوم ہوں گے، اب مثلاً آپ دیکھئے مسلکوں میں فرق ہے، رفع یدین کا، آمین بالجہر کا، اور سب حدیث شریف سے ہی اخذ کرتے ہیں، چاروں مسلک حدیث شریف سے ہی اخذ کرتے ہیں، تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ حضور ﷺ کا حکم ہو اور واضح نہ ہو، ایسا نہیں ہوسکتا، مصلحت بعض احکام میں گنجائش کی ہوتی ہوگی، جب دونوں چیزیں حضور پاک ﷺ کی حیات طیبہ میں ملتی ہوں تو مسئلہ اس کی تطبیق کا ہے، اس کی تطبیق کیسے کی جائے، یہ انسان کی دینی فہم پر چھوڑا گیا ہے، انسان کی ایک دینی فہم ہے، ایک دنیاوی فہم ہے، انسان اپنی ضرورت کے لحاظ سے، اپنی مصلحت کے لحاظ سے اپنا ذہن چلاتا ہے، اور دین کے معاملہ میں دین کو سامنے رکھ کر، دین کے مقاصد و مصالح کو سامنے رکھ کر اور دین کے مزاج کو سامنے رکھ کر اس کا ذہن چلتا ہے، آپ دینی ذہن اختیار کریں تو وہ آپ کو اسی راہ پر لے چلے گا جو صحیح راہ ہے، تو یہ جو اختلاف ہے اگر مقاصد متعین ہیں تو یہ اختلاف انسان کے لئے نعمت کا باعث ہے، اور اس میں ایک مسلک حق کے لوگ دوسرے مسلک حق کے لوگوں کو روک نہیں سکتے، اس لئے کہ وہ مسلک اس کے ماننے والوں کی دینی سمجھ کے لحاظ سے شریعت کے مقصد کے زیادہ مطابق اور حالات کے لحاظ سے زیادہ مناسب ہوسکتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو اس کے اندر گنجائش رکھی گئی ہے، اس گنجائش کے مطابق وہ اختلاف بے مقصد نہیں، کیوں کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ دین کہ جو قیامت تک کے لئے آیا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا گیا ہے، اس کے اندر خلل ہو، خلل ہو ہی نہیں سکتا، جو ہمیں خلل نظر آرہا ہے، وہ گنجائش ہے جس کو ہماری مصلحت سے رکھا گیا ہے، اس میں اختلاف کا جو موقع رکھا گیا ہے وہ اس لئے کہ اس موقع سے ہم فائدہ اٹھا سکیں، ہمارے حالات بدل سکتے ہیں، ہماری ضروریات بدل سکتی ہیں، ماحول کے ساتھ اور زمانہ کے ساتھ ہماری ضروریات بدل جاتی ہیں، اور آپ دیکھئے بعض چیزوں کی

صراحت آئی ہے، مثلاً مرض میں وضواور طہارت کا حکم بدل جاتا ہے، اسی طرح سفر میں قصر کی اجازت مل جاتی ہے، یہ تو ایسا ہے کہ اس کا حکم واضح طریقہ سے آ گیا، لیکن یہ فرق کیوں ہے، اس لئے کہ مسافر کو دشواری ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس دشواری کا حل بتا دیا، اور اسی طرح مریض کے لئے پانی کا استعمال مرض کو بڑھا دیتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے سہولت رکھ دی، اور اسی کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ اشارہ دے دیا کہ دیکھو اللہ تعالیٰ تمہاری راحت، تمہاری استطاعت کا لحاظ رکھتا ہے، اور اس سے ہمیں یہ بات معلوم ہوئی کہ یہ مذہب فطرت کے مطابق ہے، اس میں رعایت رکھی گئی ہے، انسان کی مشکلات کی، انسانوں کی ضروریات کی رعایت رکھی گئی ہے، اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ رعایت رکھی ہے تو ہمیں یہ سمجھنا چاہئے کہ جو فرق ہے سمجھنے کا اس میں اس رعایت کی وجہ سے ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے خود اس بات کی اجازت ہے کہ جو چیز ہمارے لئے زیادہ موافق ہے اور شریعت میں اس کی گنجائش ہے، اس میں ہمیں نص مل رہا ہے، تو ہم اس سے فائدہ اٹھائیں، تو ان سب چیزوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اسلام وہ دین ہے جس میں انسان کی ساری ضروریات اور اس کی مشکلات کا حل رکھا گیا ہے اور یہ کہ یہ مشکلات اور یہ ضروریات صرف ایک ہی زمانہ کیلئے نہیں ہے، بلکہ قیامت تک کیلئے ہے۔

نصوص میں وسعت اور تنوع

آپ دیکھئے کہ جب اسلام آیا تو اسلام سب سے پہلے عربوں کے پاس آیا جو جاہل قوم تھی، جہالت تھی ان میں، نہ وہ علوم سے واقف تھے، نہ ان میں تمدن تھا، دیہاتی زندگی ان کی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے جو دین عطا فرمایا، جو احکام عطا فرمائے اس حالت میں کہ وہ امی تھے، لیکن احکام کے اندر اتنی گنجائش تھی کہ تمدن آنے پر تمدن کی ضرورت پوری کی، تمدن کی ضرورت اس نے کیسے پوری کی، وہ انسان کی دینی فہم کے ذریعہ سے، عہد عباسی میں جب تمدن پوری طرح چھا گیا وہ تمدن کہاں سے آیا؟ اس کے کچھ حصے تو ایران سے

آئے، کچھ حصے یونان سے آئے، یونان، ایران، ہندوستان، قرب وجوار کے جو متمدن علاقے تھے، کچھ چیزیں وہاں سے آئیں، تو عربوں کا جو تمدن بنا وہ ان ساری چیزوں کے استفادہ سے بنا، اور خود عربوں کا جو مزاج تھا اس نے مدد کی، یہ دین کے احکام جو مسلمانوں کو دیے گئے تھے امی ہونے کے زمانہ میں دیے گئے تھے، وہ عہد عباسی میں آکر ایسا وسیع اور ایسا جامع دین کی حیثیت سے سامنے آئے کہ وہ دین انسان کے تمدن کی ساری ضرورتوں کو بخوبی پورا کرسکا اور برابر پورا کرتا رہا۔ ان کی سیاست کی ضرورتوں کو پورا کرتا تھا، ان کی مالیات کی ضروریات کو پورا کرتا تھا، لیکن یہ کیسے ہوسکا، یہ ان علماء کی محنتوں سے ہوا، جنہوں نے اپنے دینی فہم کو استعمال کیا۔

عباسی دور میں فقہاء کے اجتہادات

امام ابو یوسف کا زمانہ جو ہے وہ انتہائی تمدن کا زمانہ ہے اور تمدن کے مسائل اتنے پیچیدہ اور متنوع ہوتے ہیں کہ وہ ایک امی کے بس کے نہیں ہوتے، لیکن ان حضرات نے ان علمائے کرام نے، ان مجتہدین نے دین کی اس طرح تشریح کی، اس طرح استنباط کیا کہ زندگی کی ساری ضرورت اس سے پوری ہوتی تھی، اور انہوں نے ہر سوال کا جواب متعین کردیا، اور ایسا جواب جو شافی تھا، آپ یہ سمجھئے کہ امام ابو یوسف حنفی تھے اور انہوں نے جو استنباطات کئے ان میں حنفی فقہ کا رنگ تھا، لیکن آج بھی وہ ممالک جہاں فقہ شافعی ہے یا دوسری فقہ ہے وہاں بھی تمدنی مسائل میں استفادہ حنفی مسائل سے کیا جاتا ہے، کیوں؟ اس لئے کہ حنفیہ کے ائمہ نے جو اجتہاد کیا وہ تمدن کے زمانہ کا اجتہاد تھا، تمدن کے جو تقاضے تھے، تمدن کی جو ذمہ داریاں تھیں وہ انہوں نے پورا کیا تھا، تو آج دوسرے مسلک والوں کو ان مسائل میں اس سے استفادہ کرنا پڑتا ہے، امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ وغیرہ کی محنتوں سے فائدہ اٹھانا پڑتا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے وہ دین عطا فرمایا، وہ شریعت عطا فرمائی جو اس وقت سے لے کر قیامت تک انسانوں کی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے،

اورانسانوں کے اس تنوع کا لحاظ بھی اس میں رکھا گیا ہے جو زندگی کا تنوع ہے، کہیں پر برفیلے میدانوں میں انسان رہتا ہے، کہیں ریگستانوں میں انسان رہتا ہے، کہیں تمدن کی حالت میں ہے تو کہیں جہالت کی حالت میں ہے اور بدوی زندگی گزار رہا ہے، ہر جگہ شریعت اسلامی منطبق ہوتی ہے، اس میں کوئی دشواری نہیں ہوتی، ایسی شریعت اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائی، جو استنباطات ہوئے ہیں فقہ کے یہ عہد عباسی میں مکمل ہو چکے تھے، اور اس کے بعد مسلمانوں کی زندگی میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی، سب سے بڑی تبدیلی وہی تھی کہ مسلمان اپنے جزیرۃ العرب کے صحرائی علاقہ سے نکل کر اور پھر متمدن زندگی میں آگئے تھے، اور یورپ جہالت میں مبتلا تھا، ایران بھی پیچھے پڑ گیا اور یونان بھی پیچھے چلا گیا، اور عربوں کے پاس جو تمدن تھا اور جو ان کے قوانین تھے، جو ان کی زندگی تھی وہ پوری دنیا سے اعلیٰ معیاری زندگی تھی، اور متنوع تھی، اور شریعت نے ان ساری ضرورتوں کو پورا کیا، وہ شریعت جو ان حضرت نے طے کر دی تھی۔ اپنے مختلف مسلکوں کے اعتبار سے آپ دیکھئے کہ دوسری تیسری صدی ہجری میں چاروں مسالک مقرر ہو گئے تھے، چاروں جو مذاہب اربعہ ہیں، یہ سب دوسری تیسری صدی کے اندر کے ہیں اور شریعت اپنے اس تنوع کے ساتھ دوسری صدی میں زندگی کے تمام پہلوؤں کے لحاظ سے قابل عمل ثابت ہوئی تھی، بعد میں کچھ جزئیات آتی رہیں، لیکن انسانی زندگی میں کوئی بڑا انقلاب نہیں آیا۔

تمدنی انقلاب اور اجتہاد

اس وقت کے بعد آج عصر جدید میں جب یورپ کا تمدن سامنے آیا اور یورپ نے ترقی کی اور سائنس نے غیر معمولی ترقی کا مظاہرہ کیا تو اب کچھ مسئلے کھڑے ہوئے، اس لئے کہ زندگی ایک نئے ڈھنگ پر آئی، جس سے اب کچھ مسائل کھڑے ہو گئے، لیکن اس سے قبل ہمارے اسلاف کو کسی بڑی سوچ کی ضرورت نہیں پڑی، بس دوسری، تیسری صدی

کے اندر جو کچھ غیر معمولی محنت کرنی پڑی وہ تو محنت کی، اس کے بعد فرعی اور معمولی چیزیں تھیں جس کو علماء دیکھتے رہے اور جو سوال اٹھتے تھے جواب دیتے رہے، کوئی غیر معمولی قدم اٹھانے کی ضرورت نہیں پیش آئی تھی، لیکن یہ جو موجودہ تمدن ہے اور موجودہ ترقی ہے سائنس کی ترقی، اس نے مسائل کھڑے کئے۔

گلاسگو میں شفق کا مسئلہ

مثلاً ایک یہ مسئلہ ہے، آج سے پچیس سال پہلے مجھے ایک مرتبہ یورپ جانے کا اتفاق ہوا، انگلستان، وہ گرمیوں کا زمانہ تھا، جس میں رات بہت چھوٹی ہوتی ہے تو وہاں گلاسگو جا کر معلوم ہوا کہ یہاں ایک بڑا مسئلہ چل رہا ہے، وہ یہ کہ شفق ڈوبتی نہیں، ختم نہیں ہوتی حتی کہ فجر ہو جاتی ہے، یعنی شفق ہی فجر ہو جاتی ہے، لیکن کب ہوتی ہے، لہذا کب سے اس کو فجر سمجھا جائے اور کب تک اسے شفق سمجھا جائے، اس میں علماء کے درمیان اختلاف ہو گیا، وہاں کئی گروہ بن گئے، اہل فقہ کے گروہ، معلوم ہوا کہ فجر کی نماز یہاں جہاں ہم لوگ ٹھہرے تھے ایک جماعت آ کر بارہ ساڑھے بارہ بجے رات میں فجر کی نماز پڑھتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم نصف نصف تقسیم کر لیتے ہیں، نصف اول رات شفق میں اور نصف ثانی کو فجر میں شمار کرتے ہیں، اور دوسری جماعت یہ کہتی ہے کہ نہیں، جو معتدل علاقہ ہیں ان کا لحاظ کرتے ہوئے ہم ڈیڑھ گھنٹے کا وقت فجر کو دیتے ہیں اور ڈیڑھ گھنٹے کا وقت ہم کو شفق دیتے ہیں، چنانچہ ان کے نزدیک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد عشاء ختم ہو جاتی ہے، یعنی ڈیڑھ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دونوں کو دیا جائے گا، فجر ہو یا شفق ہو، سوا گھنٹہ یا ڈیڑھ گھنٹہ، شوافع کے یہاں غالباً سوا گھنٹہ اور احناف کے یہاں ڈیڑھ گھنٹے کے قریب ہوتا ہے، تو انہوں نے کہا کہ ہم ڈیڑھ گھنٹہ شفق کے لئے رکھتے ہیں اور ڈیڑھ گھنٹہ فجر کے لئے رکھتے ہیں، اور یہی ڈیڑھ گھنٹہ یا سوا گھنٹہ کی مدت دونوں کے لئے شروع سے چلتی رہی ہے اور کوئی انقلابی صورت حال پیش نہیں آئی۔

نصوص پر گہری نظر

لیکن موجودہ تمدن میں انقلابی صورت حال پیدا ہوگئی، اس وقت ہم کو اس طرح کی نئی باتوں میں اجتہاد کرنے کی ضرورت پڑے گی اور اسی ہمت، اسی صلاحیت کا ثبوت دینا پڑے گا عہد اول نے جس صلاحیت کا ثبوت دیا، یہ مطلب نہیں ہے کہ بغیر گہری علمی سوچ کے ہم اس میں رائے قائم کرلیں، نہیں، بلکہ اسی واقفیت، اسی ذہانت، نصوص پر وہی گہری نظر رکھتے ہوئے ہمیں کام کرنا ہوگا، جب جا کر ہم ان مسائل کا جواب دے سکیں گے جو مسائل اس وقت اٹھ رہے ہیں، اور اگر ہم ان کا جواب نہیں دیں گے تو ہماری شریعت پر شبہ کیا جانے لگے گا، شریعت کو ناقص سمجھا جانے لگے گا، جو شریعت امی عربوں کو دی گئی تھی، اگر وہ اجتہاد نہ کرتے، محنت نہ کرتے تو دنیا کہتی کہ اسلام امیوں کا مذہب ہے، دوسرے لوگ اس پر عمل کر ہی نہیں سکتے، اس لئے کہ ان میں جو تمدن آ گیا تھا اور عربوں کا بن گیا تھا، جو دنیا میں سب سے زیادہ فائق تھا، اس تمدن کے جو تقاضے تھے اگر اس کا جواب ہماری شریعت نہیں دے سکی ہوتی تو صاف سمجھا جاتا کہ یہ شریعت جزیرۃ العرب کے لئے اور ان پڑھ لوگوں کے لئے ہے، دنیا کے دوسرے حصوں کے لئے نہیں ہے، لیکن ہمارے اسلاف نے یہ پوزیشن نہیں بننے دی، اپنے کو اس میں کھپایا اور ایسے جوابات اس کے مرتب کئے اور ایسے استنباطات کئے کہ جس پر سب مطمئن ہوئے اور کوئی اس پر اعتراض نہیں کرسکتا، آج ہم کو اسی طرح کی محنت کی ضرورت ہے۔

اجتہاد کے اصول وشرائط کا لحاظ

چونکہ اب ایسے افراد نہیں ہوتے جو کہ اتنا استیعاب رکھتے ہوں، جو اتنے حاوی ہوں ان ساری چیزوں پر، ان سارے گوشوں پر کہ جن کی ضرورت پڑتی ہے اجتہاد اور استنباط کے لئے، اس لئے بہتر طریقہ یہی ہے جو ماشاء اللہ اختیار کیا جارہا ہے کہ اکیڈمیاں ہوں، مجالس ہوں،

جن میں ضروری صلاحیتوں کے علماء جمع ہوں، وہ علماء جو شریعت کے متنوع گوشوں کی ممتاز صلاحیت رکھتے ہوں، عام صلاحیت والوں کو میں نہیں کہہ رہا ہوں، ان علماء کو کہہ رہا ہوں جو اجتہاد کی اور استنباط کی اچھی صلاحیتیں رکھتے ہوں، ان میں تنوع ہوسکتا ہے، اوران کے علم کے مدارج ہوسکتے ہیں، لیکن اگر پوری جماعت بیٹھے گی تو ایک دوسرے کے مطالعہ سے، ایک دوسرے کی واقفیت سے فائدہ اٹھائے گی، اور جو مذاکرہ ہوگا اس مذاکرہ سے صحیح حل نکل سکے گا جو بہتر سے بہتر حل ہوگا اور ظاہر کہ اسی دائرہ میں نکالنا ہوگا جو نصوص کا دائرہ ہے اور پھر نصوص کے بعد اجتہاد کا دائرہ ہے، ہمارے اسلاف نے جو اجتہاد کیا ہے اور جو انہوں نے طریقہ اختیار کیا ہے، جو اصول مقرر کئے ہیں اجتہاد کے لئے اور استنباط کے لئے ان اصولوں کی بنیاد پر کرنا ہوگا، ہم اپنی طرف سے کوئی چیز ایجاد نہیں کریں گے، ہمیں اسی لائن پر چلنا ہوگا، اسی دائرہ کے اندر رہ کر کرنا ہوگا۔

دین کی خاص سمجھ ''وعی'' کا استعمال

لیکن اس میں ہم اپنی پوری ذہانت استعمال کریں گے، وہ ذہانت جسے دینی ذہانت کہنا چاہئے، اور اللہ تعالیٰ ان کو وہ عطا فرماتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کے نبی کے کلام کے ساتھ تعلق واشتغال رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ وہ پیدا کردیتا ہے، وہ ایک سمجھ ہوتی ہے، اس کو ہم سمجھ ہی کے لفظ سے ادا کرسکتے ہیں، ایک وعی ہوتی ہے جو نظر کو صحیح جگہ پہنچادیتی ہے، جیسے آدمی کا ایک ادراک ہوتا ہے کہ جو رہنمائی کردیتا ہے کہ فلاں بات تو نہیں ہوسکتی، دین کا جو مزاج ہے اس کے لحاظ سے یہ چیز مطابقت نہیں رکھتی، فقیہ شخص یہ کس بنیاد پر کہتا ہے، یہ اس سمجھ کی وجہ سے کہتا ہے جو اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے، جس طرح دنیا کی ایک سمجھ ہوتی ہے اسی طرح دین کی بھی ایک سمجھ ہوتی ہے کہ فوراً آدمی بھانپ لیتا ہے کہ یہ بات دین کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی ہے، یہ شریعت اسلامی کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی ہے، تو اس سے آدمی کی حفاظت ہوجاتی ہے، گویا کہ ایک احاطہ میں

آ گیا، جس کی وجہ سے وہ خطرہ سے بچ جاتا ہے، غلط کام نہیں کر سکتا۔

شریعت کے مقاصد سے واقفیت

یہ کام اکیڈمیوں کے ذریعہ سے، ایسی مجالس کے ذریعہ سے زیادہ بہتر طریقہ سے ہوتا ہے تاکہ اگر ایک آدمی سے کوئی بھول ہورہی ہوگی تو دوسرا آدمی اس کو متنبہ کردے گا کہ آپ کو اس کے سمجھنے میں غلطی ہورہی ہے، اس نص کا تقاضا یہ ہے، اور ہمارے بڑوں نے جو استنباط کیا تھا اس کا تقاضا یہ ہے، اس کی یہ روح ہے اور اس ضرورت کے لئے شریعت کے مقاصد کو جاننا ضروری ہے، اگر ہم مقاصد کو نہیں جانتے اور ان وجوہ واسباب کو نہیں جانتے اور سمجھتے جو شریعت کے اندر رکھے گئے ہیں تو پھر ہم کوئی بڑا کام نہیں کرسکیں گے اور کسی اچھے فیصلے تک ہم نہیں پہنچ سکیں گے، مقاصد تو بہر حال سامنے رہنے چاہئیں اور اس پر بڑا کام بھی ہوا ہے اور ہورہا ہے، اور یہ سیمینار اسی پر ہے، اللہ تعالیٰ نے صاف صاف فرمادیا ہے کہ اللہ تمہارے لئے آسانی کا ارادہ رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ تنگی کا ارادہ نہیں رکھتا، تو اس سے صاف یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی کمزوریوں کا، انسان کی ضرورتوں کا لحاظ رکھا ہے اور جو شریعت دی ہے اس میں اس بات کی گنجائش رکھی ہے کہ انسان جہاں پر کمزور پڑتا ہے، جہاں پر اس کی ضرورت کا تقاضہ خاص ہوتا ہے وہاں اللہ تعالیٰ نے گنجائش دی ہے، اور وہ گنجائش اسی بعض نصوص کے سمجھنے کے اختلاف میں ہے، جن چیزوں کے سمجھنے میں اختلاف کی گنجائش ہے تو وہ حقیقت میں اختلاف نہیں ہے، بلکہ اس میں ہمارے لئے ایک گنجائش دی گئی ہے، کہ ہم اپنے کو دیکھیں، اپنی صلاحیتوں کو ٹٹولیں اور اس کے مطابق کام کریں، اور ہمارے جو فقہ کے ائمہ ہیں انہوں نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا اور اس کی وجہ سے انہوں نے بالکل ایسی واضح تفصیل شریعت کی دے دی ہے کہ ہم گزشتہ صدیوں میں برابر آسانی کے ساتھ عمل کرتے چلے آئے، ہمیں کوئی پریشانی ودشواری نہیں ہوئی، البتہ ہم کو اب غیر معمولی قدم اٹھانے کی ضرورت پڑے گی، لیکن احتیاط کے

ساتھ اور اس سرمایہ کو سامنے رکھتے ہوئے جو ہمارے پاس نصوص کا اور اجتہادات کا ہے، دونوں کو سامنے رکھنا پڑے گا، نصوص جو ہیں پھر اجتہادات، دونوں کو دیکھ کر کرنا ہوگا، پھر خود اللہ تعالیٰ ہم کو وہ سمجھ عطا فرمادے گا کہ ہم جو فیصلہ کریں گے وہ صحیح فیصلہ ہوگا، یہ سمجھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد ہوگی۔

میں اس کو فال نیک سمجھتا ہوں کہ ہمارے ملک کے عظیم فقیہ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے یہ خیال عطا فرمایا، اس خیال کی بنیاد پر انہوں نے یہ اکیڈمی قائم کی اور پھر اس کے سیمینار منعقد ہوتے رہے، اور اس کے ورکشاپ بھی قائم ہوتے رہے، یہ بھی ورکشاپ ہے، ورکشاپ کا مطلب یہ ہے کہ جو فقہ سے تعلق رکھتے ہیں وہ عملی طور پر فقہ سے کس طرح فائدہ اٹھائیں، اور کیا اضافہ کریں، اضافہ کا ہے کا، مسائل کا اضافہ نہیں، تشریح کا اضافہ کہ ہم ایسی تشریح کرسکیں کہ کہنے والا اور سننے والا دونوں مطمئن ہوں کہ یہ شریعت کامل اور انسانی مزاج کے مطابق ہے، تو یہ صلاحیت پیدا کرنے کے لئے عملی مشق کی ضرورت ہوتی ہے اور ورکشاپ کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس کی وضاحت کی جائے کہ کس طرح آدمی کام کرے اور کس طرح اپنی صلاحیتوں کو کارآمد بنائے، میں اتنی ہی باتیں کہہ سکتا ہوں، اس میں کوئی اضافہ نہیں کرسکتا، بس خوشی کا اظہار کرتا ہوں، اور دعا کہ اللہ تعالیٰ اس کے بہتر نتائج پیدا کرے، لیکن ایک بات جو طلبا کی حیثیت سے اس ورکشاپ میں شریک ہوئے ہیں ان سے عرض کروں گا کہ یاد رکھئے علم کا معاملہ اپنی محنت پر ہے، نہ استاذ کچھ کرسکتا ہے، اور نہ کتب خانے اور نہ مدرسے کچھ کرسکتے ہیں، محنت کراتی ہے، محنت جتنی کریں گے اتنی ہی کامیابی ہوگی، باقی یہ سب ذرائع ہیں، استاذ بھی ذریعہ ہے، کتب خانہ بھی ذریعہ ہے اور مدرسہ بھی ذریعہ ہے، اس ذریعہ کو استعمال کریں گے لیکن ہوگا وہی جو آپ کی محنت سے ہو، اپنے کو کھپانے سے ہوگا، اپنے دماغ کو بھی اور اپنی توجہ کو بھی جتنا آپ لگائیں گے، اتنی ہی آپ ترقی کریں گے انشاء اللہ، اور اس بات کو بھی آپ ذہن میں رکھیں کہ

آدمی کی قیمت یہ ہے کہ وہ دنیا کو کیا دیتا ہے، اور کیا اضافہ کرتا ہے، یہ انسان کی اصل قیمت ہے اور اگر یہ نہیں ہے تو کوئی بڑی قیمت اس کی نہیں، آپ کیا دنیا کو دے کر جائیں گے، دنیا سے سب کو جانا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ آپ کیا دے کر جائیں گے، کیا اضافہ کر کے جائیں گے؟ آج جن لوگوں کا نام تاریخ میں چمک رہا ہے جن اہل علم کا، وہی ہیں جنہوں نے دنیا کو کچھ دیا ہے، جن سے دنیا آج تک فیض اٹھا رہی ہے، تو ہم دنیا کو کیا دیں گے اور کیا اضافہ کریں گے، یہ ہے ہماری اصل قیمت، اس قیمت کو پیدا کرنے کی ضرورت ہے، کہ ایسی صلاحیت پیدا کی جائے کہ ہم کچھ دے سکیں، کچھ اضافہ کر سکیں۔

اللہ تعالیٰ ہم کو اور آپ سب کو ان چیزوں میں لگنے اور اپنے کو لگانے کی توفیق عطا فرمائے، کہ جس سے امت اسلامیہ کو، شریعت اسلامیہ کو تقویت حاصل ہو اور مدد ملے،

وآخر دعوانا أن الحمدلله رب العالمين۔

عہد اول میں اجتہاد کی تاریخی حیثیت

عہد رسالت میں اجتہاد

رسول اللہ ﷺ کا زمانہ اسلامی تشریع کا زمانہ تھا، آسمان سے وحی الٰہی کا نزول ہو رہا تھا، زندگی کے دینی مسائل سے متعلق احکامات آرہے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان احکامات کی وضاحت فرماتے، جن کی اتباع لازم ہوتی اور کبھی آپ صحابہ کے کسی عمل کو دیکھ کر خاموش رہتے، اس سے بھی حکم ثابت ہوتا، کبھی آپ کوئی رائے پیش کرتے، یا اپنی رائے کے مثل عمل کرتے تو یہ بھی اللہ کے حکم کے مطابق ہوتا، تا آنکہ وحی کے ذریعہ اس میں تصحیح نہ ہو جائے، اس طرح رسول اللہ ﷺ کے عہد میں شرعی احکام متعین ہو رہے تھے۔ لہذا جب بھی کوئی نیا واقعہ پیش آتا اور مسلمان اس واقعہ کے سلسلہ میں اللہ کے حکم سے واقف نہیں ہوتے تو وہ رسول اللہ ﷺ سے اس کا حکم دریافت کرتے، آپ ﷺ پر یا تو وحی نازل ہوتی اور آپؐ اس کے مطابق فتویٰ دیتے، یا نبوی فہم کی روشنی میں جو کہ مؤید من اللہ ہوتی جواب دیا کرتے تھے۔

البتہ جو صحابی رسول اللہ ﷺ کی صحبت سے دور کسی سفر میں یا کسی مہم پر مامور ہوتے، اور انہیں کوئی معاملہ پیش آتا جس کا حکم انہیں معلوم نہیں ہوتا تو وہ حضرات اپنی فکر کا استعمال کرتے اور اجتہاد کرتے، کیوں کہ انہیں اسی کی ہدایت دی گئی تھی، حضرت معاذ بن جبل کو جب رسول اللہ ﷺ نے یمن روانہ فرمایا تو ان سے پوچھا کہ جب تمہارے سامنے کوئی معاملہ آئے تو کیسے فیصلہ کرو گے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اللہ کی کتاب کی روشنی میں فیصلہ

کروں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے پھر پوچھا، اگر اس کا حکم تمہیں کتاب اللہ میں نہ ملے تو؟ انہوں نے کہا کہ اللہ کے رسولؐ کی سنت میں تلاش کروں گا۔ آپ ﷺ نے پھر فرمایا کہ اگر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں بھی وہ حکم نہ ملے تو؟ حضرت معاذ نے جواب دیا: اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا، اور اس میں کوئی کوتاہی نہیں کروں گا۔ آپ ﷺ نے حضرت معاذؓ کو شاباشی دی اور پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے رسول کے قاصد کو ایسی بات کی توفیق دی جس سے اللہ اور رسول راضی ہیں۔(۱)

صحابہ کرام کے اجتہاد کا طریقہ

جب رسول اللہ ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے تو وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا، اب ایسے مسائل جن کے بارے میں کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ میں کوئی صراحت نہ ہوتی، ان میں اجتہاد کے ذریعہ ہی شرعی حکم متعین کیا جا سکتا تھا، اور وہ اس طرح کہ اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت میں اس کی نظیر تلاش کی جائے، اور دینی بصیرت کا استعمال کیا جائے، کہ رسول اللہ نے حضرت معاذؓ کو اسی کا حکم دیا تھا۔

اس طرح اسلامی شریعت میں اجتہاد کا آغاز ہوا، اور اجتہاد کا یہ عمل تسلسل کے ساتھ وسیع پیمانہ پر جاری رہا، جو مسلمانوں کی وسیع زندگی کے موافق تھا، رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے بعد جب صحابہ کرامؓ کے سامنے ایسے معاملات پیش ہوتے جن سے متعلق اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت میں کوئی صراحت نہیں پاتے، تو اجتہاد کا سہارا لیتے، اس اجتہاد کو یہ حضرات ''رائی'' سے بھی تعبیر کرتے تھے، چنانچہ کبھی ان کی رائے کسی مسئلہ میں ایک ہوئی، اس طرح اس مسئلہ کے حکم پر اجماع ہو جاتا اور پھر یہ اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت سے ثابت حکم کی طرح سمجھا جاتا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہی معمول تھا کہ جب کسی معاملہ میں اللہ کی

---

(۱) سنن أبي داود، کتاب الأقضیۃ، باب اجتھاد الرأی فی القضا، حدیث نمبر:۳۵۹۲

کتاب اور رسول کی سنت میں کوئی حکم نہیں پاتے تو اجتہاد کرتے، حضرت عمرؓ کا عمل بھی یہی تھا۔ انہوں نے جب قاضی شریح کو کوفہ کے منصب قضاء پر مامور فرمایا تو ان کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

''أنظر ما يتبين لك في كتاب الله، فلا تسأل عنه أحداً، وما لم يتبين لك فاتبع فيه سنة رسول الله وما لم يتبين لك في السنة فاجتهد فيه برأيك''۔

اللہ کی کتاب سے جو حکم ثابت ہو اس پر غور کرنا، اور پھر اس کے بارے میں کسی سے دریافت مت کرنا، اگر وہاں حکم نہ ملے تو رسول کی سنت میں اسے تلاش کرنا، اگر وہاں بھی حکم نہ ملے تو خود اپنی رائے سے اجتہاد کرنا۔

اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو آپ نے یہ مکتوب بھیجا:

'الفهم الفهم فيما تلجلج في صدرك ماليس في كتاب ولا سنة أعرف الامثال والأشباه وقس الأمور عندذلك'

'' تمہارے دل میں جو بات کھٹکے، اور اس حکم سے متعلق کتاب اور سنت میں کوئی صراحت نہ ملے تو اس کی نظیر تلاش کرو، اور پھر اس پر قیاس کرو'' (۱)

صحابہ کے عہد میں اجتہاد ان کے دینی فہم اور شرعی ذوق کے تابع تھا، جو ذوق انہیں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بیس سالہ رفاقت وصحبت میں حاصل ہوا تھا، ان کا اجتہاد نفسانی خواہشات اور مادی اغراض سے پاک تھا، کیوں کہ صحابہ کرام دین کے معاملہ میں بڑے سخت تھے اور ان میں امانت بدرجہ اتم موجود تھی، لیکن جب صحابہ کا عہد ختم ہو گیا تو پھر بعد والوں میں سے ہر ایک پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا، پھر صحابہ کی نسل ختم ہو جانے کی وجہ سے

---

(۱) الانصاف فی بیان سبب الاختلاف، ص:۵۱

اجتہاد ہوائے نفس، دینی بصیرت کی کمی اور علم میں درک نہ رکھنے والوں سے بھی متاثر رہا، جس کی وجہ سے امانت اور دینی بصیرت رکھنے والے اہل علم فن اجتہاد کو منقح اور مدون کرنے میں لگ گئے اور اسے ایک فن کی حیثیت دی، تاکہ جب ایسے ظنی مسائل میں غور وفکر کی ضرورت ہو، جس میں شک یا احتمال ہے، اور کسی رائے کو طے کرنا ہو تو ان قواعد اور اصول وضوابط کی طرف رجوع کیا جا سکے۔(۱)

اس طرح ائمہ فقہ نے اجتہاد کی بنیادیں قائم کیں، اور اسے ایسے فن کی شکل میں مدون کیا جس کے نقوش واضح ہوں، تاکہ دینی زندگی کے مسائل میں جو اللہ کا حکم معلوم کرنا چاہے وہ اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ اجتہاد کی تدوین کا یہ عمل دوسری صدی ہجری میں انجام پایا۔

اجتہاد کا یہ دور جس کی بنا صحابہ کرامؓ نے ڈالی تھی، تیسری صدی ہجری تک جاری رہا، گویا خلفاء راشدینؓ کے زمانہ سے اموی خلافت، عباسی دور کے آغاز اور اندلس میں اموی حکومت تک، اس میں فقہاء صحابہ، فقہاء تابعین اور ہر علاقہ کے فقہاء جن کی آراء رائج ہیں، ان سب کے اجتہادات شامل ہیں، پھر ائمہ فقہ کے تلامذہ اور ان کے متبعین کا دور آیا، اس کے بعد پھر تقلید کا زمانہ شروع ہوا اور اس وقت سے اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا۔(۲)

اجتہاد کا مطلب

دینی اصطلاح کے مطابق اجتہاد کا مطلب جیسا کہ علماء کی تحریروں سے واضح ہے یہ ہے کہ فروعی مسائل میں شرعی حکم جاننے کے لئے پوری محنت صرف کر دینا تفصیلی دلائل کی روشنی میں، یہ دلائل چار ہیں: کتاب، سنت، اجماع اور قیاس۔ یہی اجتہاد بالرأی ہے، اور جو اجتہاد کا یہ عمل کرے وہ مجتہد ہے، علماء کی رائے میں مجتہد ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو

---

(۱) الانصاف فی بیان سبب الاختلاف، ص: ۹۷

(۲) موسوعۃ جمال عبدالناصر للفقہ، المجلس الأعلیٰ، قاھرہ، ج ۱ ص: ۲۴

پانچ علوم کا جامع ہو، کتاب اللہ کا علم، سنت رسول اللہ کا علم، علماء سلف کے اجماع اور اختلافات کا علم، لغت کا علم، قیاس کا علم، (۱) کتاب وسنت سے احکام کے استنباط کا طریقہ یہ ہے کہ جب کتاب وسنت کے نصوص میں حکم نہ ملے تو اجماع میں تلاش کیا جائے گا، اور اجتہاد ایسی رائے ہے جس پر علماء کا اتفاق نہیں ہوا ہے، لہذا جب کسی رائے پر اتفاق ہوجائے تو وہ اجماع کہلائے گا، اس طرح اجماع اجتہاد کے مقابلہ زیادہ قوی ہے، اور اجتہاد اجماع کے مقابلہ دوسرے نمبر پر ہے۔

پہلی صدی کے علماء اجتہاد کی تعریف اپنی اصطلاح میں اس طرح کرتے ہیں:

"أنه استفراغ الجهد وبذل غاية الوسع إما فى استنباط الأحكام وإما فى تطبيقها"

احکام مستنبط کرنے یا اس کی تطبیق میں پوری قوت صرف کرنا اور ممکن حد تک محنت کرنا۔

تو اس طرح اجتہاد کے دو شعبے ہیں: احکام کا استنباط اور اس کی توضیح وتشریح اور مستنبط احکام کی تطبیق اور زمانہ کے تقاضہ کے مطابق ان کی تخریج۔

پہلا حصہ اجتہاد کامل ہے، اجتہاد کی اس قسم کے بارے میں علماء کی یہ رائے ہے کہ یہ سلسلہ کسی زمانہ میں ختم ہوجاتا ہے، جمہور علماء کی یہی رائے ہے، جبکہ فقہاء حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ اس اجتہاد سے کوئی زمانہ خالی نہیں ہوتا ہے۔

اجتہاد کے دوسرے جزء کے سلسلہ میں علماء کا اتفاق ہے کہ کوئی زمانہ اس سے خالی نہیں ہوتا، یہ علماء تخریج کہے جاتے ہیں، جو احکام کے قواعد کو جزوی اعمال پر منطبق کرتے ہیں، اس تطبیق کے ذریعہ ان مسائل کا حکم ظاہر ہوتا ہے جن میں گزشتہ کامل مجتہدین کی کوئی

---

(۱) عقد الجید فی الاجتہاد والتقلید ص:۳-۵

رائے منقول نہیں ہوتی۔(۱)

تدوین فقہ کا پہلا دور

عہد اسلامی کے پہلے دور میں فقہ اسلامی اور اس کے مسائل بالکل سادہ اور غیر مدون شکل میں تھے۔ یہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کا زمانہ تھا، اس کے بعد تابعین اور تبع تابعین کا دور آیا، تو ہر عبادت کے ارکان، شرائط و آداب متعین کیے گئے، اور دلائل کی روشنی میں احکامات کی تفصیلات طے ہوئیں، علماء نے بہت سے مسائل اپنی طرف سے فرض کیے اور پھر اجتہاد کے ذریعہ ان کے احکام مقرر کیے۔(۲)

پہلے دور میں اسلامی شریعت کی سادگی کا یہ حال تھا کہ جب رسول اللہ ﷺ وضو کرتے تو صحابہ آپ کے وضو کے طریقہ کو دیکھتے اور پھر اسی کے مطابق وضو کرتے، قطع نظر اس کے کہ کون سا فعل رکن ہے اور کون سنت۔ آپ ﷺ نماز پڑھتے تو صحابہؓ آپ کی نماز کو دیکھتے پھر اسی کے مطابق خود نماز ادا کرتے، اکثر مسائل میں آپ کا یہی طریقہ تھا۔ اس وقت آپ نے یہ متعین نہیں فرمایا تھا کہ وضو کے فرائض چار ہیں یا چھ، اور نہ ہی فرضی مسائل متعین کر کے ان کے حکم تلاش کرنے کا مزاج تھا کہ ہوسکتا ہے کوئی شخص یکے بعد دیگر اعضاء کو نہ دھوئے پھر اس وضو کے صحیح ہونے یا فاسد ہونے کا حکم لگایا جاتا، بلکہ صحابہ کرامؓ کم ہی ان جیسی باتوں کے بارے میں سوال کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے اصحاب رسولؐ سے کوئی بہتر جماعت نہیں دیکھی، انہوں نے آپؐ سے صرف تیرہ مسائل میں سوالات کیے، یہاں تک کہ آپؐ کی وفات ہوگئی، یہ تیرہ سوالات قرآن میں موجود ہیں۔ مثلاً 'یسئلونك عن الشهر الحرام قتال فيه'(۳) 'یسئلونك عن المحيض'(۴) وغیرہ۔

---

(۱) تاریخ المذاهب الاسلامیة فی السیاسة والعقائد و تاریخ المذاهب الفقهیة، ص:۳۲۱

(۲) الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف، ص:۳۴-۳۵ (۳) سورۂ بقرہ، ۲۱۷ (۴) سورہ بقرہ:۲۲۲

انہی کا قول ہے کہ صحابہ کرامؓ نے انہی چیزوں کے بارے میں دریافت کیا جو ان کے لئے نفع بخش ہو،(۱)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول جیسا کہ ظاہر ہے صرف قرآن سے متعلق ہے، احادیث میں اس طرح کے بہت سے سوالات مذکور ہیں، صحابہ کرامؓ اپنے معاملات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فتویٰ طلب کرتے، اور آپ فتویٰ دیا کرتے تھے، اسی طرح جب آپ کی خدمت میں مقدمے پیش کیے جاتے تو آپؐ فیصلے فرماتے، آپؐ صحابہؓ کو اچھا کام کرتے دیکھتے تو اس کی تعریف کرتے اور جب کوئی غلط عمل کرتے دیکھتے تو اس پر نکیر فرماتے، یہ ساری چیزیں تمام صحابہؓ کی موجودگی میں نہیں ہوتا، اس لئے عموماً صحابہ میں سے کوئی بھی سارے احکام اور آپؐ کے جملہ ارشادات سے واقف نہیں ہوتا، بلکہ جو مجلس میں حاضر ہوتے وہی اس مجلس کی باتوں کو جانتے تھے۔(۲)

اس لئے حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ جب کسی مسئلہ سے واقف نہیں ہوتے تو اس مسئلہ سے متعلق رسولؐ کا ارشاد صحابہ کرامؓ سے معلوم کرتے، جب ان کو کوئی صراحت مل جاتی اور حکم ثابت ہو جاتا، تو اسی کے مطابق یہ حضرات فیصلہ فرماتے اور جب حدیث یا حکم نہیں پاتے تو اپنے اس فہم سے اجتہاد کرتے جس کی نشو ونما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں ہوئی تھی، خود صحابہ کرامؓ کے درمیان کسی مسئلہ پر حکم ثابت کرنے میں باہم اختلاف رائے ہو جاتا، تو ہر شخص کے سامنے وہ بات ہوتی جو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دیکھا یا آپ سے سنا تھا۔ تو آپس میں مناظرے ہوتے اور پھر کسی مناسب حال حکم پر متفق ہوتے۔

اس کے بعد صحابہؓ مختلف علاقوں میں پھیل گئے، ہر جگہ کے مسلمان اپنے علاقہ کے صحابی سے مسائل دریافت کرتے اور ان کے فتاویٰ پر اعتماد کرتے، صحابہ کے ان فتاویٰ کی بنیاد پر جو انہوں نے اپنے اپنے علاقوں میں دیئے، احکام میں اختلاف پیدا ہوا۔

---

(۱) الانصاف فی بیان سبب الاختلاف، ص:۱۶ (۲) حوالہ سابق، ص:۱۷-۱۸

تابعین کے زمانہ میں فقہ

الغرض اصحاب رسولؐ کے مسالک الگ الگ ہوگئے، ان صحابہ سے تابعین میں سے ہر شخص نے اپنی استطاعت کے مطابق علم سیکھا، رسول اللہ کی احادیث اور صحابہ کرامؓ کی آراء کو یاد کیا، ان کو سمجھا اور پھر صحابہ کی مختلف آراء جو انہیں مل سکیں ان کو جمع کیا، ان میں بعض اقوال کو دوسرے پر ترجیح دی، بعض اقوال ان کی نظر میں ضعیف ٹھہرے، گرچہ وہ کبار صحابہ سے منقول تھے، مثلاً جنبی کے تیمم سے متعلق حضرت عمر و بن مسعودؓ کی رائے کو ضعیف قرار دیا ، کیونکہ اس کے مقابلہ میں حضرت عمارؓ، عمران بن حصین اور دیگر صحابہ کی رائے مشہور تھی، اس طرح علماء تابعین میں سے ہر عالم کا اپنا اپنا مسلک بنا۔

ان میں ہر ایک ایک شہر کے امام مقرر ہوئے، مثلاً حضرت سعید بن المسیب اور حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر، ان دونوں کے بعد امام زہری، قاضی یحییٰ بن سعید اور ربیعہ بن عبدالرحمٰن مدینہ میں، اسی طرح عطاء بن رباح مکہ میں، ابراہیم نخعی اور شعبہ کوفہ میں، حسن بصری بصرہ میں، طاؤس بن کیسان یمن میں، مکحول شام میں امامت کے منصب پر فائز ہوئے، حضرت سعید بن المسیب اور ان کے ساتھیوں کی رائے تھی کہ فقہ میں حرمین کے علماء سب سے بہتر اور کامل ہیں، ان حضرات کے مسلک کی بنیاد حضرت عمر و عثمانؓ کے فتاویٰ اور فیصلے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ کے فتاویٰ اور مدینہ کے قاضیوں کے فیصلوں پر ہے۔(۱)

ابراہیم نخعی اور ان کے ساتھیوں کی رائے یہ تھی کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ صحابہ میں فقہ کے میدان میں سب سے بہتر اور کامل ہیں، ان لوگوں کے مسلک کی بنیاد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے فتاویٰ، حضرت علیؓ کے فتاویٰ اور فیصلے، قاضی شریح اور کوفہ کے قضاۃ کے فیصلوں پر ہے۔

---

(۱) الانصاف فی بیان سبب الاختلاف للامام ولی اللہ دہلوی، ص: ۳۰-۳۱

حضرت سعید بن المسیب فقہاء مدینہ کے لسان ناطق تھے، وہ حضرت عمرؓ کے فیصلوں اور حضرت ابوہریرہؓ کی مرویات کو زیادہ یادرکھنے والے تھے، جبکہ ابراہیم نخعی فقہاء کوفہ کے گل سرسبد تھے، جب یہ دونوں کوئی رائے پیش کریں اور اس کی نسبت کسی امام کی طرف نہ کریں تب بھی اکثر ان کی رائے صراحۃً یا اشارۃً سلف میں سے کسی کی طرف منسوب سمجھی جاتی ہے، تو ان دونوں فقہاء پر ان کے علاقہ والوں نے اتفاق کیا، ان سے علم سیکھا، اس میں غور وفکر کیا اور پھر ان کی آراء کی روشنی میں جدید مسائل کی تخریج کی۔

ائمہ اربعہ کے اجتہادات اور اس کی بنیادیں

حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت زید بن حارثؓ اور ان کے شاگرد مثلاً سعید بن المسیب وغیرہ کی آراء اہل مدینہ کے نزدیک زیادہ لائق اخذ وقبول تھے، انہی آراء پر امام مالک نے اپنے مسلک کی بنیاد رکھی، یہ اور ان جیسے حضرات کے ذریعہ اس مسلک میں روایت اور فتویٰ کا علم وجود پذیر ہوا، امام مالک کے اصحاب اور تلامذہ نے امام مالک کی روایات اور ان کے مختار اقوال کو جمع کیا، ان کی تلخیص وتوضیح کی، امام مالکؒ کے تلامذہ مغرب اور دنیا کے دیگر حصوں میں پھیلے، اور ان کے ذریعہ سے بہت سے لوگوں کو فائدہ پہنچا، امام مالکؒ کی کتاب مؤطا اس کی بین دلیل ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، ان کے تلامذہ، حضرت علیؓ، قاضی شریحؒ اور امام شعبیؒ کے فیصلے اور ابراہیم نخعیؒ کے فتاویٰ کو اہل کوفہ نے سب سے زیادہ قابل اعتبار سمجھا اور اختیار کیا، انہی حضرات کی آرا پر امام اعظم ابوحنیفہؒ کے اجتہادات کی بنیاد ہے، امام صاحبؒ اپنے استاذ ابراہیم نخعیؒ کے مسلک کی روشنی میں مسائل کی تخریج بڑی عمدگی ومہارت کے ساتھ کرتے اور فروعی مسائل کے استنباط میں بڑے نکتہ رس تھے۔

آپ کے سب سے مشہور شاگرد ابو یوسفؒ ہیں، جو خلیفہ ہارون رشید کے زمانہ میں عراق، خراسان اور ماوراء النھر میں قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز ہوئے، تصنیف کے لحاظ سے سب میں فائق اور درس کے بڑے پابند محمد بن حسن شیبانی ہیں، انہوں نے امام ابو حنیفہؒ اور ابو یوسفؒ دونوں سے استفادہ کیا، پھر مدینہ منورہ تشریف لے گئے، وہاں امام مالکؒ سے مؤطا کا درس لیا، پھر اپنے شہر لوٹے اور مؤطا کی روشنی میں اپنے مسلک کو تطبیق دی۔

فقہ کے ان دونوں دبستانوں کے وجود میں آنے اور ان کے اصول وفروع مرتب ہو جانے کے بعد امام شافعیؒ کی پیدائش ہوئی، امام شافعیؒ نے اپنے متقدمین فقہاء کی کاوشوں پر غور کیا، اس میں انہیں بعض ایسی چیزیں نظر آئیں جن کی وجہ سے انہوں نے اسی طریقہ کو اختیار کرنے سے خود کو باز رکھا، اپنی کتاب الأم کے شروع میں انہوں نے اس کو بیان کیا ہے، جب انہوں نے اجتہاد کے سلسلہ میں متقدمین کی روش کو دیکھا تو ازسر نو فقہ کو پڑھا، اس کے اصول مقرر کئے، پھر ان اصول کی روشنی میں فروعی مسائل الگ کئے، اور کتابیں تصنیف کیں اور بہت عمدہ اور نفع بخش کام کیا۔(۱)

اس کے بعد امام احمد بن حنبل کا دور شروع ہوا، انہوں نے امام شافعیؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، اور پھر انہی کے طریقہ پر آگے بڑھے ساتھ ہی انہوں نے صحیح احادیث کے نصوص سے اعتنا پر زور دیا، کیوں کہ وہ صاحب فن محدث بھی تھے، انہوں نے احادیث کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا تھا، اس طرح ان کا طریقہ اجتہاد مستقل مسلک شمار ہو تو ترتیب کے لحاظ سے یہ چوتھا مسلک بن گیا۔

اہل سنت والجماعت نے بس انہی چار دبستان فقہ پر اعتماد کیا، ان کے آراء کی پیروی کرتے ہیں اور عموماً ان ائمہ کے آراء کے دائرہ میں ہی اجتہادی کاوشیں انجام دیں۔

یہیں سے تقلید کا زمانہ شروع ہوتا ہے، اور یہ دراصل ایسے لوگوں کے لئے ضروری تھا

---

(۱) الانصاف فی بیان سبب الاختلاف، ص: ۳۹-۴۱

جو قرآن وحدیث اور اجماع صحابہ وتابعین سے مکمل واقفیت نہیں رکھتے تھے، کیونکہ یہی واقفیت کسی کو جدید مسائل میں اجتہاد کا اہل بناتی ہے۔

ائمہ اربعہ کا امتیاز

ان ائمہ اربعہ نے شریعت کے بے شمار مسائل وحوادث پر غور کیا اور نہ صرف اپنے زمانہ کے پیش آمدہ مسائل کا حل بتایا بلکہ جو مسائل آئندہ پیش آسکتے تھے ان کے بارے میں بھی شرعی حکم بیان کردیا۔ اور اس طرح بعد والوں کو جو مسائل پیش آسکتے تھے ان سے بڑی حد تک بے نیاز کردیا، اور ان کے لئے اجتہاد کے مواقع کم ہی چھوڑے۔

فقہی مسالک کی نشو ونما اور وسیع اجتہادی عمل کا دور دراصل ایسے عہد کا ساتھ دینا تھا جس میں اس وسیع اجتہاد کی شدید ضرورت تھی، یہ ضرورت اس لئے پیدا ہوئی کہ اسلامی نظام حکومت کی تاثیر ونفوذ کی وجہ سے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی اور ان کی طرز معاشرت میں بہت سی تمدنی وتہذیبی تبدیلیاں پیدا ہوگئیں تھیں، عرب کی محدود اور سادہ زندگی وسیع عربی زندگی میں بدل گئی، جس نے معاصر ترقی یافتہ زندگی کی بہت سے اچھائیوں کو اپنالیا۔ اس لئے ضروری تھا کہ اسلامی فقہ نئی زندگی میں والے سوالات کا جواب دے، فقہاء اربعہ نے اس ضرورت کو پوری دیانت وامانت اور باریک بینی کے ساتھ اپنے دور رس اجتہادی کاوشوں کے ذریعہ پورا کیا، پھر زندگی کی گاڑی ایک زمانہ تک اس روش پر رواں دواں رہی، اور اس میں کوئی بڑی اور نمایاں تبدیلی واقع نہیں ہوئی، سوائے چند فروعی اور جزوی مسائل کے جو زمانہ وحالات کی تبدیلی سے پیدا ہوئے تھے جن میں فتاویٰ کی ضرورت تھی، باکمال علماء اس ضرورت کو اسی اجتہادی دائرہ میں رہ کر پورا کرتے تھے جسے ائمہ اربعہ نے متعین کیا تھا، اس درمیان ایسے نابغۂ روزگار علماء پیدا ہوئے جو اپنے عظیم الشان کارناموں اور اپنی دوربین فہم وذکاء کی وجہ سے ائمہ اربعہ سے قریب تھے، ان کی کاوشوں نے بڑا فائدہ پہونچایا، یہ سارے فقہاء ائمہ اربعہ کی طرف ہی منسوب ہوئے۔

فقہ ائمہ اربعہ کے مصادر

علماء نے اجتہاد کے شرائط اور اس کے حدود کو متعین کرنا شروع کیا چونکہ علماء اسلامی زندگی میں ایسے حالات کے پائے جانے کو مستبعد نہیں سمجھتے تھے جہاں اجتہاد کی ضرورت پیش آئے، اس لئے اسی وقت انہوں نے اجتہاد کے فن پر غور کیا، اور اس کے حدود و قیود متعین کئے ،تاکہ کوئی اس کے دائرہ سے تجاوز نہ کرے، اور پھر اجتہاد نااہل لوگوں کے ہاتھ میں بازیچہ اطفال نہ بن جائے، چنانچہ انہوں نے اجتہاد سے متعلق ہر گوشہ کی حد بندی کی، اس کی بنیاد اور منہج مقرر کیا تاکہ اسلامی شریعت پر غور کرنے والا ان خطوط کے مطابق اصول فقہ کی روشنی میں اپنا علمی و تحقیقی سفر جاری رکھے، اس سلسلہ میں امام شافعیؒ نے بڑی نفیس بحث کی اور آنے والوں کے لئے تحقیق کا دروازہ کھول دیا۔

ائمہ اربعہ نے ایسے طریقے کو اختیار کیا جو ان کے اجتہاد کے لئے مناسب تھا، ہر امام اپنے طریقہ اجتہاد پر تھے، مثلاً امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اجتہاد کے ارکان میں کتاب اللہ پہلے درجہ میں، سنت نبویؐ دوسرے درجہ میں، اور صحابہؓ کے اقوال تیسرے درجہ میں تھے، اس کے بعد قیاس، استحسان اور عرف کا درجہ تھا۔

امام مالک بن انسؒ نے اہل مدینہ کے عمل کو بنیاد بنایا، اس کے بعد صحابہؓ کے فتاویٰ، قیاس، مصالح مرسلہ، استحسان اور ذرائع بالترتیب تھے۔

امام شافعیؒ نے کتاب اور سنت کو اصل قرار دیا، اس کے بعد اجماع، اقوال صحابہ اور قیاس کے درجے تھے، وہ استحسان کو پسند نہیں کرتے تھے۔

امام احمد بن حنبلؒ نے کتاب اور سنت کے نصوص کو پہلا درجہ دیا، اس کے بعد صحابہؓ کے فتاویٰ، اگر صحابہ میں باہم اختلاف رائے ہے تو آپ اس رائے کو اختیار کرتے جو کتاب وسنت کے موافق ہوتی، اس کے بعد تابعین کی آراء اور اخیر میں قیاس کا درجہ تھا۔(۱)

---

(۱) تاریخ المذاھب الاسلامیۃ فی السیاسۃ والعقائد و تاریخ المذاھب الفقہیۃ للشیخ محمد ابوزھرۃ (اختصاراً)

اجتہاد کے شرائط

علماء نے اجتہاد کی اہلیت کے لئے جو شرائط بیان کیئے ہیں وہ اس طرح ہیں:

۱-عربی زبان سے گہری واقفیت

۲-قرآن کا علم

۳-احادیث کا علم

۴-اختلاف اور اجماع کے مقامات مثلاً اصول فرائض، نماز، رکعات نماز وغیرہ سے واقفیت

۵-قیاس کی واقفیت

۶-مقاصد شریعت کی واقفیت

۷-صحت فہم اور صحت ذوق

۸-نیت کی درستگی اور عقیدہ کی سلامتی

مجتہدین کے طبقات

اجتہاد کے مراتب اور مجتہدین کے طبقات علماء کے نزدیک اس طرح ہیں:

۱-مجتہد مطلق: ایسے مجتہدین جو مستقل حیثیت رکھتے ہوں اور صحابہ کے علاوہ کسی کے تابع نہ ہوں، اس زمرہ میں حضرت سعید بن المسیب، حضرت ابراہیم نخعی، فقہاء تابعین میں، صاحب مسلک فقہاء میں امام جعفر صادق، امام ابوحنیفہ، امام مالک بن انس، امام محمد بن ادریس شافعی، امام احمد بن حنبل، امام اوزاعی، امام لیث بن سعد، امام سفیان ثوری اور دیگر فقہاء شمار کئے جاتے ہیں، بعض لوگوں نے امام ابویوسف اور امام محمد بن حسن کو بھی اس زمرہ میں شمار کیا ہے۔

شافعی فقہاء اور اکثر حنفی فقہاء کی رائے یہ ہے کہ اجتہاد مطلق کا دروازہ کھلا رکھا

جا سکتا ہے، جبکہ متاخرین فقہاء نے اس دروازہ کو بند کر دیا ہے، باوجودیکہ اجتہاد مطلق کے دروازہ کو بند کرنے کی رائے زیادہ مضبوط نہیں ہے، اور امام مالکؒ سے اس سلسلہ میں دونوں طرح کی رائے منقول ہے، جبکہ فقہاء حنابلہ اس دروازہ کو بند نہیں مانتے، بلکہ وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ کسی زمانہ کا مجتہد مطلق سے خالی ہونا درست نہیں ہے۔

۲- مجتہد منتسب: ایسے مجتہدین جو اپنے ائمہ کے اصول اجتہاد کے پابند ہوں، البتہ فروع میں ان سے اختلاف رائے بھی کرتے ہوں، ائمہ اربعہ کے بعد کوئی زمانہ ایسے مجتہدین سے خالی نہیں رہا ہے، مثلاً امام طحاویؒ، امام کرخیؒ وغیرہ۔

۳- مجتہد مذہب: یہ حضرات ایسے مسائل کے استنباط میں اجتہاد کرتے ہیں جن میں ان کے مسلک کے امام کی کوئی رائے موجود نہ ہو۔

۴- اصحاب ترجیح: یہ حضرات ائمہ سے منقول آراء کے درمیان اس ضابطہ کے مطابق ترجیح قائم کرتے ہیں، جسے مجتہدین مذہب نے متعین کیا ہے، یہ طبقہ اوپر والے طبقہ یعنی مجتہد مذہب کی طرح ہے، اسی لئے دونوں طبقوں کو ایک بھی شمار کیا گیا ہے۔

۵- طبقہ مستدلین: یہ لوگ ائمہ کے اقوال سے استدلال کرتے ہیں، ان پر مسائل کی بناء رکھتے ہیں، ان کی آراء کے درمیان موازنہ کرتے ہیں، یہ طبقہ بھی پچھلے طبقہ کی طرح ہے۔

۶- طبقہ حفاظ

۷- طبقہ مقلدین

امام ابوحنیفہؒ کے مسلک میں مجتہد مطلق منتسب کا دور تیسری صدی کے بعد ختم ہوگیا، اس لئے کہ مجتہد منتسب کوئی عبقری محدث ہی ہوسکتا ہے، جبکہ فقہاء احناف کا حدیث سے اشتغال کم رہا ہے، اور اس مسلک میں مجتہد مذہب ہوئے ہیں، اسی کے متعلق بعض نے کہا ہے کہ مجتہد مذہب وہ ہوسکتا ہے جسے کم سے کم مبسوط یاد ہو۔(۱)

---

(۱) الانصاف فی بیان سبب الاختلاف، ص:۸۴

امام مالکؒ کے مسلک میں مجتہد منتسب بہت کم ہوئے ہیں، اور جو لوگ اس مرتبہ تک پہونچے، ان کے آراء واقوال کی مسلک میں زیادہ حیثیت نہیں ہے، جیسے ابو عمر جو ابن عبد البر سے مشہور ہیں، اور قاضی ابو بکر ابن عربی وغیرہ۔

حنبلی دبستان فقہ میں بھی ایسے قدیم وجدید مجتہد ہر ایک دور میں بہت کم ہوئے ہیں، البتہ نویں صدی ہجری تک ہر دور میں مسلسل مجتہدین پیدا ہوتے رہے ہیں۔

فقہ حنبلی کا تعلق فقہ شافعی سے اسی طرح ہے جیسے امام ابو یوسفؒ وامام محمدؒ کا امام ابو حنیفہؒ کی فقہ سے، البتہ امام احمدؒ کا مسلک امام شافعیؒ کے ساتھ جمع نہیں کیا گیا، اس لئے وہ مستقل مسلک ہے، اور صاحبین کی آراء امام کے ساتھ جمع کی گئیں اس لئے اسے مستقل مسلک کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی۔

شافعی دبستان فقہ میں سب سے زیادہ مجتہد مطلق، مجتہد مذہب پیدا ہوئے، اسی طرح اصولی اور متکلم بھی اس مسلک میں سب سے زیادہ ہوئے ہیں، قرآن کے مفسرین اور حدیث کے شارحین کی بھی اس مذہب میں کثرت ہے، یہ سند اور روایت کے اعتبار سے زیادہ سخت ہیں، اپنے امام کے نصوص کو اچھی طرح یاد رکھنے والے، امام کے اقوال اور ان کے اصحاب کے آراء کے درمیان فرق کرنے والے اور اقوال کے درمیان زیادہ ترجیح دینے والے ہیں، امام شافعی کے مسلک کی بنا جن احادیث وآثار پر ہے، وہ مدون اور مشہور ہیں۔ دوسرے مسلک والوں کو یہ امتیازی حیثیت حاصل نہیں ہے، امام شافعیؒ نے اپنے مسلک کی بنیاد امام مالکؒ کی مؤطا پر رکھی ہے، اس کے علاوہ صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن أبی داؤد، سنن ترمذی، سنن ابن ماجہ، سنن دارمی، اور پھر مسند شافعی، سنن نسائی، سنن دارقطنی، سنن بیہقی، بغوی کی شرح السنۃ، یہ سب اس کے مسلک کے مصادر واساس میں ہیں، اور جہاں تک امام بخاری کا تعلق ہے تو فقہ شافعی میں ان کی حیثیت مجتہد منتسب کی ہے۔(۱)

---

(۱) الانصاف فی بیان سبب الاختلاف، ص: ۸۵-۸۶

تقلید کی شروعات اور اس کے اسباب

اب جہاں تک اجتہاد کے تقلید میں بدلنے کی بحث ہے، تو یہ مختلف اسباب کے پائے جانے، مرور زمانہ کے اثر اور متاخرین کا متقدمین کی تقلید کی نفسیات کی وجہ سے وجود میں آیا، اس کی مختصر تاریخ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے الفاظ میں اس طرح ہے:

''معلوم ہونا چاہئے کہ چوتھی صدی سے قبل لوگ کسی ایک اور متعین مسلک کی تقلید پر متفق نہیں تھے۔ ابو طالب مکی قوت القلوب میں لکھتے ہیں: کتابیں اور مجموعے یہ سب نئی چیزیں ہیں، فقہاء کے اقوال کی روشنی میں اظہار رائے، ایک متعین فقیہ کے مذہب پر فتویٰ، ہر مسئلہ میں کسی ایک فقیہ ہی کی رائے قبول کرنا، کسی ایک مسلک میں تفقہ پیدا کرنا، یہ ساری باتیں دوسری اور تیسری صدی میں نہیں تھیں، میں کہتا ہوں کہ دو صدی کے بعد ان میں مسائل کی تخریج کا سلسلہ شروع ہوا، پھر بھی چوتھی صدی میں لوگ کسی ایک مسلک کی مکمل پیروی کرنے، اسی کے مطابق تفقہ پیدا کرنے اور اس کی رائے کو نقل کرنے میں متفق نہیں تھے، جیسا کہ تتبع سے معلوم ہوتا ہے، بلکہ ان میں خواص بھی تھے اور عوام بھی۔

عوام کی یہ حالت تھی کہ ایسے متفق علیہ مسائل جن میں مسلمانوں یا جمہور مجتہدین کے درمیان اختلاف نہیں ہے، ان میں صرف صاحب شرع کی پیروی کرتے تھے۔ وضو، غسل، نماز، زکوۃ وغیرہ کا طریقہ انہوں نے اپنے آباواجداد اور اپنے علاقہ کے معلمین سے سیکھا تھا، اسی کے مطابق وہ عمل کرتے تھے، البتہ جب کوئی نیا واقعہ پیش آتا تو مسلک کی تعین کے بغیر جو مفتی مل جاتے، ان سے فتویٰ معلوم کر لیتے تھے۔

اور خاص لوگوں کی یہ حالت تھی کہ وہ حدیث کا علم رکھتے تھے،

حدیث سے ان کا اشتغال تھا، وہ مسئلہ سے متعلق نبی کریم ﷺ کی احادیث یا صحابہؓ کے آثار سے اس قدر اخذ کر لیتے، جس کے بعد انہیں مزید کسی چیز کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی، یہ روایتیں عموماً مشہور درجہ کی ہوتیں یا صحیح درجہ کی، ان پر بعض فقہاء بھی عمل کر چکے ہوتے، اور اس پر عمل نہ کرنے والے کے پاس کوئی عذر نہ ہوتا، یا پھر ان کے سامنے جمہور صحابہ وتابعین کے اقوال ہوتے، اس کی مخالفت بھی صحیح نہیں تھی، اگر مذکورہ مسئلہ سے متعلق حدیث میں تعارض یا ترجیح واضح نہ ہونے کی وجہ سے کوئی ایسی چیز نہیں پاتے جس سے ان کا دل مطمئن ہو، تو پھر وہ ماضی کے فقہاء کے اقوال کی طرف رجوع کرتے، اگر انہیں دو اقوال ملتے تو ان میں جو زیادہ اعتماد کے قابل ہوتا اس کو اختیار کر لیتے، خواہ یہ قول اہل مدینہ کا ہو یا اہل کوفہ کا، ان ہی خواص میں اصحاب تخریج بھی تھے، یہ حضرات جب کسی مسئلہ میں صریح حکم نہیں پاتے تو اصول کے مطابق مسائل کی تخریج کرتے یا مسلک کے دائرہ میں رہ کر اجتہاد کرتے، اور یہ سبھی اپنے ائمہ کے مسلک کی طرف منسوب ہوتے، مثلاً کہا جاتا کہ فلاں حنفی ہے، فلاں شافعی، محدثین بھی ائمہ سے زیادہ موافقت کی ہونے کی وجہ سے ان کی طرف منسوب کیے جائے، مثلاً نسائی اور بیہقی شافعی کہلاتے، اس زمانہ میں افتاء اور قضاء کا فریضہ مجتہدین ہی سنبھالتے تھے، فقیہ کو مجتہد ہی کہا جاتا تھا۔ ان صدیوں کے بعد دوسرے لوگ پیدا ہوئے اور وہ مختلف علاقوں میں پھیل گئے“۔(۱)

اس طرح یہ سلسلہ جاری رہا اور پھر یہی تقلیدی علماء کے نزدیک پسندیدہ قرار پایا، کہ یہ

(۱) حجۃ اللہ البالغہ، ج۱، ص: ۴۳۸

لوگ اس دائرہ سے برائے نام ہی نکلتے تھے، اور جب ضرورت سخت ہو جاتی تو اپنے مسلک کے آراء کے درمیان ہی اس کا حل ڈھونڈھتے، یہ بات کی صدیوں کے حالات کے موافق تھی اور اسی پر جمنے کو انہوں نے شریعت کو کھلواڑ بننے اور مسلمان نفس پرست حکمرانوں کے اثر خاص طور پر تاتاری اور مغلیہ حکومت میں محفوظ رکھنے کا ذریعہ سمجھا، اس لئے ضروری تھا کہ شریعت کی حفاظت کی جائے، اور فقہ اسلامی کے ائمہ متقدمین کے اجتہاد پر ہی اکتفا کیا جائے، اسی میں شریعت کی حفاظت کا راز مضمر تھا، تا کہ فقہ ذاتی و دنیوی مصالح کی بنیاد پر نفس پرستوں کا نشانہ نہ بن جاتے۔

مسلمانوں کی تمدنی زندگی تقریباً اسی روش پر گامزن رہی جو دوسری اور تیسری صدی میں فقہ اسلامی کی تدوین کے دور میں تھی اور بعد کے زمانہ میں کوئی بڑی اور اہم تبدیلی واقع نہیں ہوئی، جس کی وجہ سے مستقل اجتہادی عمل کی ضرورت پڑتی۔

تمدنی انقلابات اور اجتہاد کی ضرورت

لیکن جب مشرق کو جدید مغربی تمدن کا سامنا ہوا اور ایسے چیلنجز پیش آئے جو ان تمدنی چیلنجز سے اہمیت میں کسی طرح کم نہیں تھے جو مسلمانوں کے جزیرۃ العرب سے نکلنے، ترقی یافتہ قوموں سے ملنے اور ان کی سادہ و بدوی زندگی سے نکل کر تمدنی اور اجتماعی زندگی کے بلاخیز سمندر میں داخل ہوتے وقت پیش آیا تھا، اور جن حالات و مشکلات کا مقابلہ دین اور علم میں سند رکھنے والے ائمہ نے اپنی محنتوں سے کیا تھا، وہ ان تقاضوں کو پورا کرنے اور ان کا حل پیش کرنے میں کامیاب ہوئے جو ان کے مصالح اور ان کی خصوصیات کے موافق تھا، اس حیثیت سے کہ وہ آسمانی اور ہمیشہ رہنے والی امت ہیں۔

امت اسلامیہ آج پھر اپنی تمدنی واجتماعی زندگی میں تقریباً انہی مشکلات اور جدید چیلنجز سے دوچار ہے جو اس زمانہ کے چیلنجز کے مشابہ ہیں، یہ چیلنجز امت کے لائق وفائق علماء سے مخلصانہ کاوش اور دینی امانت کے ساتھ بلند علمی لیاقت کا منتظر ہیں، ان چیلنجز کا

جواب انہی شرائط کے مطابق دیا جاسکتا ہے جن کی تفصیل اجتہاد کے عمل سے گزرنے والے فقہ اسلامی کے ائمہ نے بیان کیا ہے۔

تمدنی زندگی میں ایسے مسائل پیش آچکے ہیں جن کا مسلمانوں کو بہرحال سامنا کرنا ہے اور علماء کے لئے ان کا حل تلاش کرنا ضروری ہے، مسلمان یا تو ان مسائل سے پہلو تہی اور انکار کرتے ہیں یا اس کی طرف مکمل جھک جاتے ہیں، یہ دونوں طریقے اس اسلامی دین سے میل نہیں کھاتا جو ہر زمانہ اور ہر علاقہ کا دین ہے اور جو قیامت تک باقی رہنے والا ہے، اس لئے علماء امت پر ضروری ہے کہ ایسی راہ تلاش کریں جو ان کے اجتہاد میں معاون ہو، اجتہاد کا دروازہ اس طرح کھولیں جو شریعت اسلامی کی روح اور اس کے مزاج سے ہم آہنگ ہو، بلکہ ان مشکلات کا ایسا حل پیش کریں جس سے ثابت ہو کہ دین اسلام ہر زمانہ اور ہر علاقہ کا ساتھ دینے والا ہے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ اجتماعی اجتہاد کا طریقہ اختیار کیا جائے، اجتماعی اجتہاد انفرادی اجتہاد اور شخصی تحقیق سے کہیں زیادہ بہتر اور زیادہ محفوظ ہے۔ کیوں کہ ذاتی اجتہاد اسلامی شریعت سے گہری واقفیت اور اجتہادی صلاحیت کے باوجود ایک فرد یا ایک محدود چھوٹی جماعت کا اجتہاد کسی فرد یا جماعت کی خواہش یا کسی سیاسی وملکی مصلحت کا شکار ہوسکتا ہے۔

بعض جدید مسائل اوران کے پیدا ہونے کے اسباب

جن جدید مسائل میں فقہی بحث اور اجتہاد کی ضرورت ہے ان میں ایسے مسائل بھی ہیں جو معاشی اور مالی نظام سے متعلق ہیں، یہ اقتصادی نظام نہ صرف متمدن انسانی دنیا میں رائج ہے بلکہ مروجہ اقتصادی تحریکات پر بھی یہی نظریات غالب ہیں، اس نظام کی ساری کلیں سود سے چلتی ہیں، جسے اللہ اور اس کے رسول محمد ﷺ نے صراحت کے ساتھ حرام قرار دیا ہے، اب ان معاشی مشکلات کا حل کیا ہے؟

اس طرح کچھ مسائل سفر کی تیز ترین سہولیات فراہم ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں،

ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ شمال وجنوب میں ایسے علاقے بھی ہیں جہاں مختلف زمانوں میں دن اور رات عام دنوں سے زیادہ لمبے ہوتے ہیں، اسی طرح اب دوسرے کرہ ارض میں بھی لوگ جانے لگے ہیں، ان سارے مسائل کا تعلق براہ راست دین اور عبادت سے ہے۔

جدید مسائل میں بعض شریعت کے اصل سرچشمے قرآن وحدیث سے متعارض نہیں ہیں، البتہ ان فقہی توجیہات واقوال سے متعارض ہیں، جنہیں ہمارے فقہاء نے اپنی عقل اور بصیرت سے مختلف شرعی احکام سے متعلق بیان کیا ہے، ان توجیہات اور آراء میں اجتہاد کا معاملہ زیادہ دشوار نہیں ہے، مثلاً آلہ مکبر الصوت (لاؤڈ اسپیکر) کی آواز انسانی آواز ہے، یا محض آواز بازگشت ہے۔ اس مسئلہ میں ابتداء میں علماء کے درمیان اختلاف رائے تھا، ایک طبقہ نے اس کو منع کیا، مگر اب یہ اختلاف ختم ہو چکا ہے، اسی طرح دوران پرواز جہاز میں نماز پڑھنے کا مسئلہ ہے کہ ایسی نماز درست ہوگی یا نہیں؟ بعض علماء نے ایک زمانہ تک جہاز پر نماز کو درست قرار نہیں دیا، اس وجہ سے کہ جہاز پر نماز پڑھنے میں فقہی نقطہ نظر سے زمین پر سجدہ کا تحقق نہیں ہوگا، بعد میں یہ مسئلہ بھی ختم ہو گیا۔

ایک مسئلہ شمالی یورپ میں پیدا ہوا ہے، جہاں گرمی کی راتوں میں شفق ابیض غائب نہیں ہوتا ہے، علماء نے اس پر غور کیا کہ جب فجر کی نماز کے واجب ہونے کی علت نہیں پائی جاتی تو فجر کی نماز واجب ہوگی یا نہیں؟ پھر شفق ابیض کے غائب نہ ہونے سے روزہ کے ابتداء وقت کا مسئلہ بھی پیچیدہ ہو گیا کہ روزہ کو کب سے شروع مانا جائے، اس مسئلہ میں یورپی ممالک کے علماء کے درمیان غور وفکر جاری ہے۔

یہ بعض جدید مشکلات ہیں، یہ سمجھا جاتا ہے کہ موجودہ فقہی کتابوں میں جو توجیہات موجود ہیں ان سے یہ مسائل ہم آہنگ نہیں ہیں، اس لئے بہتر یہ ہے کہ یہ اور ان جیسے دوسرے مسائل میں شریعت کے مقاصد اور عبادت کی روح کو بھی پیش نظر رکھا جائے، جو کتاب وسنت کے نصوص سے تمام احکام میں ثابت ہیں، صرف ان فقہی نظریات اور

توجیہات کو نہ دیکھا جائے جو عہد تشریع کے بعد کسی خاص زمانہ میں وضع کیے گئے۔

اجتہاد کا غلط استعمال

البتہ بعض آزاد ذہن مسلمان ودانشوران احساس کمتری کے شکار اور جدید مغربی تہذیب سے مرعوب مسلم حکام جس اجتہاد کا نعرہ لگاتے ہیں، ان کا مقصد اس تغیر پذیر زندگی کے لئے بہتر اور مناسب حل تلاش کرنا نہیں ہے، بلکہ وہ اسلامی شریعت کو موجودہ حالات سے ہم آہنگ اور ضم کرنا چاہتے ہیں، خواہ اس سے متعلق شریعت میں صراحت موجود کیوں نہ ہو، مثلاً یہ لوگ ایسے احکام میں ترمیم چاہتے ہیں جن میں عورت کو جاہلی تبرج (بے محابہ بناؤ سنگار) اور عریانیت سے منع کیا گیا ہے، اسی طرح نکاح اور طلاق کے احکام میں ترمیم چاہتے ہیں، عبادات کے لئے اوقات کی پابندی کو ختم کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ یہ احکام کتاب وسنت میں صراحت کے ساتھ مذکور ومنصوص ہیں، ان لوگوں کی طرف سے اجتہاد کا مطالبہ مسائل حل کرنے کے لئے نہیں ہے بلکہ وہ شریعت محکم اور نا قابل تبدیل احکام میں تبدیلی چاہتے ہیں، یہ دراصل اجتہاد کے صحیح لفظ سے غلط مطلب نکالنا ہے۔

شریعت میں اجتہاد کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو حکم اسلامی شریعت کے مصادر سے ثابت شدہ اور قطعی ہے اس کو بدل دیا جائے، بلکہ اس سے مراد کسی ایسے ظنی معاملہ میں شریعت کا حکم متعین کرنا ہے جس کے بارے میں کوئی صراحت یا قطعی دلیل موجود نہ ہو۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی شریعت کے بعض احکام قطعی ہیں اور بعض ظنی، جو احکام قطعی ہیں ان میں کسی طرح کی کمی یا زیادتی کی گنجائش نہیں، کوئی عالم یا محقق اپنے علم اور عقل سے اجتہاد کرتے ہوئے اس میں تبدیلی یا ترمیم نہیں کرسکتا، بلکہ ان احکام میں دوبارہ غور وفکر کرنا بھی صحیح نہیں ہے، مثلاً نماز، ان کے اوقات، اور اس کی قطعی اور منصوص شکلیں، اس کے علاوہ دیگر فرض عبادات وغیرہ، یہ سب قطعی احکام ہیں، اسی طرح ایسے مسائل جن کی حرمت ثابت ہے، مثلاً شراب، جوا، خنزیر کا گوشت، سود اور ان کے علاوہ محرمات اور گناہ کبائر وغیرہ

بھی قطعی احکام ہیں۔

البتہ جو احکام ظنی ہیں اور جن کے بارے میں شریعت کے مصادر میں کوئی قطعی صراحت موجود نہیں ہے اور جن میں کسی کی صورت کو متعین کرنے یا حکم متعین کرنے میں رائے استعمال کی گنجائش ہے، ایسے مسائل میں دین کی روح اور شریعت کے احکام سے گہری واقفیت رکھنے والے علماء اپنی رائے دیں گے، ان میں مختلف صورتوں کے درمیان کسی ایک صورت کو متعین کریں گے، یا اسی طرح کے کسی دوسرے حکم پر قیاس کر کے نئے مسائل کا حکم متعین کریں گے۔

جن مسائل میں قرآن وحدیث سے کوئی صراحت موجود نہیں ہے وہاں مجتہد کا کام کتاب وسنت میں غور کرنا، اس کے نظائر تلاش کرنا اور پھر ان پر قیاس کرنا ہے، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے ابوموسیٰ اشعریؓ سے فرمایا تھا۔(۱)

شریعت کے احکام میں سے کسی حکم کی نئی شکل پیدا ہونے پر علماء ہی اجتہاد کی ضرورت کو متعین کریں گے، اور جو علماء دینی بصیرت اور ممتاز علمی لیاقت کے حامل ہوں وہی جتہاد کریں گے، نہ کہ ہر کس وناکس جو علم کا دعویدار اور خود کو مسلمان کہے اسے اجتہاد کی اجازت ہوگی۔

---

(۱) المدخل إلی أصول الفقہ۔للدکتور معروف الدوالیبی، ص:۵۵، مواطن الاجتھاد فی الشریعۃ الاسلامیۃ للأستاذ محمد المدنی، ص:۹-۱۵ ناشر: مکتب المنار الکویت

فقہی اختلاف کی حقیقت اور حیثیت

اللہ تعالیٰ نے اسلام کو ایک جامع وہمہ گیر دین بنایا، جو زندگی کے تمام گوشوں کو شامل ہے، یہ بہت معتدل اور افراط وتفریق کے نقص سے پاک ہے، جس پر عمل بہت آسان ہے، اس میں جہاں سابقہ آسمانی مذاہب کی ساری خوبیاں جمع ہیں، وہیں نبی کریم ﷺ کے زمانہ سے دور اخیر تک کے پیدا ہونے والے حالات ومشکلات کی رعایت بھی ہے۔

زمانہ اور حالات کی تبدیلی

یہ حقیقت ہے کہ زمانہ کی تبدیلی، زندگی کے بدلتے حالات اور انسانی علوم کی ترقی وفروغ سے حالات بدلتے ہیں، چنانچہ گزشتہ زمانہ کے مقابلہ اس دور اخیر میں علم کی طرف رجحان بہت بڑھا ہے، اور زمانہ کی ترقی کے ساتھ وہ بھی مسلسل ارتقائی مراحل طے کر رہا ہے، جیسا کہ جدید مادی اکتشافات مسلسل سامنے آرہے ہیں اور اس کا دائرہ وسیع تر ہوتا جارہا ہے، انسان ایسے ذرائع اور وسائل حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے، جن کی وجہ زندگی بہت آسان ہوچکی ہے۔ کام کی رفتار تیز اور مواصلات کے ذرائع وسیع ہوچکے ہیں، دور دراز ملکوں تک جلدی پہنچ سکتے ہیں۔ انہی سہولیات کی وجہ سے انسانی زندگی اب عالمی (گلوبل) ہوچکی ہے۔ سماجی علوم کے فروغ، تمدنی انقلاب، تہذیبی ترقی اور مادی وسائل کی بہتات کی وجہ سے دنیا کے کنارے باہم مل چکے ہیں اور وہ ایک گھر یا ایک خاندان کی شکل اختیار کرچکی ہے، اب دنیا کے کسی گوشہ میں کوئی واقعہ رونما ہوتا، کوئی انوکھی بات پیش آتی ہے تو دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا کے لوگ اس سے اس طرح واقف ہوجاتے ہیں، گویا یہ واقعہ

اس کے شہر یا خاندان میں پیش آیا ہو۔

مختلف علاقوں کے درمیان جغرافیائی فرق

لوگوں کے درمیان آپسی تعارف اور ایک دوسرے کے حالات سے واقفیت نے زندگی کے طور طریق اور طرز معاشرت میں بڑی یکسانیت اور یک رنگی پیدا کر دی ہے، باوجودیکہ ایک علاقہ کی جغرافیائی حالت دوسرے علاقہ سے مختلف ہوتی ہے، ہر جگہ کی اپنی جداگانہ خصوصیات ہوتی ہیں جو دوسری جگہ نہیں پائی جاتی، جن کا اثر وہاں کے رہنے والوں پر نمایاں ہوتا ہے، اس لئے اگر دنیا کے کسی حصہ میں زندگی کی بعض سہولیات فراہم ہوں تو ضروری نہیں کہ یہ سہولیات دوسری جگہوں پر بھی موجود ہوں۔ مثلاً ایک علاقہ میں پینے کا صاف پانی کم پایا جاتا ہے، جبکہ دوسری جگہ اس کی فراوانی ہے، دنیا کے ایک حصے میں کاشت کے قابل اور شاداب زمینیں ہیں، جبکہ دوسرا حصہ دور دور تک چٹیل میدان ہے، قابل کاشت کوئی ٹکڑا نہیں، کہیں خشک پہاڑ ہے، پانی اور سبزہ کا نشان نہیں اور کہیں کے پہاڑ سبز درختوں سے ڈھکے ہوئے ہیں، اسی طرح سمندر کے قریب ساحلی علاقے ہیں جہاں مچھلی اور سمندری جانوروں کی فراوانی ہے، وہیں ایسے خشک علاقے بھی ہیں جہاں پینے کا پانی بھی مشکل سے میسر آتا ہے، اور اس کے لئے ان کو بڑی جدوجہد کرنی ہوتی ہے، وہاں کے باشندے جانور پالتے ہیں، اور اسی پر ان کی زندگی کا انحصار ہے۔

بعض علاقے ایسے بھی ہیں جہاں درجہ حرارت بہت زیادہ ہوتی ہے، جبکہ بعض علاقوں میں موسم بہت معتدل اور متوازن ہوتا ہے، اسی طرح رقبہ کے اعتبار سے بھی دو علاقوں میں بڑا فرق ہوتا ہے، اسی لئے ہر علاقہ والے اپنے علاقائی حالات اور طرز معاشرت کے اعتبار سے زندگی کی سہولیات سے فائدہ اٹھاتے اور مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں۔

شریعت میں انسانی مصالح کی رعایت

جب ہم اسلامی شریعت پر گہری نظر ڈالتے ہیں جو کہ تا قیامت ہمیشہ رہنے والا دین ہے اور جو کرۂ ارضی کی پوری انسانیت کے لئے آیا ہے، تو ہمیں اس میں باریک حکمت، بے مثال توازن اور انسان کے مصالح اور منافع کی بڑی رعایت نظر آتی ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی شریعت خدائی شریعت اور آسمانی دین ہے اور یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا 'الدین یسر' (دین آسان ہے) آپ نے مزید فرمایا :'لن یشاد الدین أحد الا غلبه' (۱) کوئی شخص دین میں سختی کو نہ اختیار کرے ورنہ وہ خود ہی مغلوب ہو جائے گا، آپ ﷺ نے اعتدال، میانہ روی اور تمام معاملات میں آسانی کو اختیار کرنے کا حکم دیا، تاکہ دین پر عمل کرنے میں کسی کو پریشانی نہ ہو، اگر یہ نظام نہ ہوتو کسی علاقہ میں شریعت کے بعض احکام پر عمل کرنا آسان ہوتا اور کسی علاقہ میں زیادہ یا کم دشوار، اور یہ چیز اس دین کے دائمی ہونے، پوری انسانیت کے لئے راہِ نجات ہونے، زمانہ کے شانہ بشانہ چلنے، حالات کا ساتھ دینے اور قیامت تک باقی رہنے کی صلاحیت پر سوالیہ نشان لگا دیتی، رسول اللہ ﷺ نے دین کے احکام کی جو تشریح اور وضاحت کی ہے اس میں ہمیں صاف آتا ہے کہ اس میں انسانی ضروریات کا خاص خیال رکھا گیا ہے اور انسانوں کے لئے آسانی فراہم کرنے پر خصوصی توجہ دہ گئی ہے۔

رسول اللہ ﷺ دین کے بعض احکام پر عمل کے سلسلہ میں ایک سے زائد طریقہ اختیار فرماتے ہیں، اسی طرح بعض مواقع پر ایک حکم پر صحابہ نے مختلف انداز سے عمل کیا اور آپ ﷺ اس پر خاموش رہے، یہ اتفاقی امر نہیں تھا اور نہ یہ سہواً و جہالۃً ہوا، بلکہ حضورؐ نے بعض مسائل میں بعض خاص حالات میں رخصت اور سہولت دی، ہم ان جیسے حالات میں اس

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب الدین یسر، حدیث نمبر: ۹۳

سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اسی طرح صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ بعض اعمال کئی طریقوں سے انجام دیتے ہیں، انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ کسی موقع پر صحابہ کو بعض احکام بتاتے ہیں، پھر جب یہ لوگ نہیں ہوتے، دوسرے ہوتے ہیں تو آپؐ انہی احکام میں دوسری ہدایت دیتے ہیں، اس طرح صحابہ کرامؓ کی دونوں جماعتیں اپنے اپنے علم اور واقفیت کے مطابق ان احکام کو یاد کرتی اور پھر اس کے مطابق ان احکام کی تعلیم دیتی، اس لئے دور اول میں مسائل کی توضیح وتفسیر میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں ان کی وجہ صحابہ کا علم ہے جس سے وہ واقف ہوتے، اس بنیاد پر ان مسائل میں علماء کی آراء میں اختلاف ہوا جس سے مختلف فقہی مسالک وجود میں آئے، یہ بظاہر الگ الگ ہیں مگر اصل کے لحاظ سے سب ایک ہیں، اور ان سب کا سرچشمۂ حقیقی رسول اللہ ﷺ کا ارشاد یا عمل ہے۔

احکام کی وضاحت میں رسول اللہ ﷺ سے اس طرح فرق واختلاف کا پایا جانا، یا کسی حکم میں آپ کے عمل کا کئی طریقوں سے منقول ہونا، کسی غلطی یا نسیان کی وجہ سے کیوں کر ہوسکتا ہے کہ جب اللہ کے نبی ﷺ اللہ کی طرف سے ایسا دین لے کر آئے جو صاف ستھرا اور دن کے اجالے کی طرح روشن ہے، پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ آپ ﷺ سے بھول چوک ہوجائے، یہ شریعت اس لئے نازل ہوئی تھی کہ قیامت تک باقی رہے، پھر کیسے ممکن ہے کہ نقص یا کمی اس میں سرایت کرجائے، لہٰذا حقیقت یہ ہے کہ یہ اختلاف اللہ کی طرف سے انسانوں کے لئے رحمت ہے، یہ عظیم نعمت ہے، اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے بندوں پر احسان کیا ہے۔ مثال کے طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض مذاہب میں طہارت کے مسائل میں سختی ہے، جبکہ دوسرے مسالک میں آسانی ہے، اگر قطعی اور یقینی طور پر ایک حکم ہی متعین کردیا جاتا تو ان ممالک کے باشندوں کے لئے بڑی پریشانی ہوتی جہاں پانی کم پایا جاتا ہے اور جہاں پانی کی فراوانی ہے وہاں اس سے متعلق احکام میں زیادہ وسعت غیرضروری

معلوم ہوتی۔

اسی طرح سمندر کے مختلف ساحلوں پر رہنے والے لوگوں کے لئے آبی جانوروں کی وہ قسمیں حلال کی گئی ہیں، جن کی وجہ سے وہ پریشانی اور دشواری میں رہتے، اور جو لوگ سمندر سے دور اور پانی کے سرچشموں سے پَرے رہتے ہیں ان کے ساتھ یہ مشکلات نہیں ہیں، اس لئے اس باب میں ایسے لوگوں کے لئے سہولت کی ضرورت نہیں ہے۔

اختلاف رحمت ہے

مختلف روایات میں اور صحابہ کے مختلف افعال میں جو وسعت اور تنوع دیکھتے ہیں اور ان میں جو ظاہراً اختلاف نظر آتا ہے وہ دراصل انسانی ضروریات اور بشری تقاضوں کی رعایت ہے، دین اسلام نے اس کی تکمیل کی ہے، جس سے مذہبِ اسلام کا ہر خطہ اور علاقہ کے لئے مناسب اور متوازن ہونا ثابت ہوتا ہے، یہی توازن ہمیں اس اختلاف میں بھی نظر آتا ہے جو مختلف دبستان فقہ کے فقہاء کے درمیان دلائل وبراہین سے مسائل مستنبط کرنے میں پایا جاتا ہے، ان اختلافات کا سرچشمہ اور اس کی اصل رسول اللہ ؐ کا عمل، آپؐ کے ارشادات اور آپؐ کی تشریحات ہیں یا جو ان پر مبنی ہیں وہ ہیں، دراصل یہ سارے اختلافات شرعی ہیں اس لئے کہ ان سب کا سرچشمہ ایک ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ورعایت ہے۔

ان مختلف دبستان فقہ کے ہر ایک امام نے اپنی رائے پوری دقت نظر اور امانت داری کے ساتھ قرآن وحدیث سے اخذ کیا ہے، اور وہ خود علم وتحقیق اور اخلاص وتقویٰ کے لحاظ سے ثقہ اور امین ہیں، تو پھر ان کے اجتہاد کو گمراہی وضلالت کیسے کہا جاسکتا ہے، ہاں! یہ ممکن ہے کہ اسے اجتہادی غلطی سے تعبیر کیا جائے، اور اس سلسلہ میں جو مجتہد کی غلطی سے واقف ہو وہ اس پر عمل نہ کرے، لیکن مجتہد کو اس کے اجتہاد کا ثواب بہر حال ملے گا، جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے، لیکن اس مسلکی اختلاف اور مسائل کے تنوع کو تفرقہ وانتشار کا ذریعہ بنانا مناسب نہیں ہے اور نہ یہ کہ کوئی خود کو صاحب حق اور دوسرے کو گمراہ قرار دے، اس لئے کہ

یہ اجتہادی معاملہ ہے، غور وفکر اور سنجیدگی کے ساتھ ان مسائل میں احتیاط ضروری ہے، بنواسرائیل جب اس طرح کے انتشار کا شکار ہوئے اور اپنے خلاف رائے رکھنے والوں کو ایذا پہنچائی تو اللہ تعالیٰ نے اس پر نکیر فرمائی، قرآن نے مسلمانوں کو بار بار تلقین کیا ہے کہ وہ اتحاد اور محبت کو اپنا شیوہ بنائیں اور اسلامی اخوت ومساوات پر عمل پیرا ہوں۔

مسلکی تعصب

یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ جب سارے لوگ یہ جانتے اور مانتے ہیں کہ اس زمانہ میں اہل سنت والجماعت کے جتنے معروف فقہی مسالک ہیں، خواہ وہ حنفی مسلک ہو، یا مالکی یا شافعی یا حنبلی یا اس کی فرع سلفی، سب کے سب اپنے اجتہاد کے مطابق حق پر ہیں، اس کے باوجود ان مسالک کے ماننے والے ایک دوسرے سے کشیدہ رہتے ہیں، بسا اوقات اپنے مسلک کی حمایت میں دوسرے سے دشمنی کرتے ہیں اور اس طرح ان پر طعن کرتے ہیں گویا یہ اسلام وکفر کا اختلاف ہو، اور اپنے اجتہاد کی روشنی میں وہی صرف واضح حق پر ہوں، دوسرے کا مسلک باطل وگمراہ ہو اور اس کے ماننے والے گمراہی پر ہوں، کبھی کبھی یہ صورت حال بڑی تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔

اس طرح کی کچھ صورتحال گزشتہ زمانہ میں بھی پیش آئی، لیکن اس زمانہ میں یہ تعصب پسندانہ رجحانات بعض جماعتوں میں نامناسب حد تک پہنچ گئے ہیں، چنانچہ اس کشمکش کے نتیجہ میں امت کی وحدت پارہ پارہ ہو کر رہ جائے گی، ہر مسلک والے اپنی جماعت کے لوگوں کو حقیقی مسلمان اور دوسروں کو گمراہ اور دین سے منحرف سمجھتے ہیں، بلکہ کبھی تو بعض لوگ دوسرے کے پیچھے نماز بھی نہیں پڑھتے، حالانکہ قرآن وحدیث میں اس کی بڑی تاکید آئی ہے کہ مسلمان باہم تفرقہ نہ ڈالیں اور ایک متحد امت بنے رہیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: وکونوا عباداللّٰہ إخواناً (۱) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: إن هذه أمتكم

---

(۱) صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۶۰۶۴

أمة واحدة وأنا ربكم فاعبدون (۱)۔اسی طرح ہمیں حکم دیا گیا کہ انبیاء کے بارے میں یہ اعتقاد رکھیں 'لانفرق بین أحد من رسله' (۲) حالانکہ ہر نبی کی شریعت دوسرے انبیاء کی شریعت سے بعض احکام میں الگ ہوتی ہے، مگراس کے باوجود مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا کہ ان کے درمیان فرق نہ کریں۔

کبھی دو حقیقی بھائیوں کے درمیان اختلاف ہوجاتا ہے، مگر یہ اختلاف ان کے بھائی ہونے پر اثر انداز نہیں ہوتا، اسی طرح جب ایک مجتہد اجتہاد کرتا ہے، قرآن وحدیث سے مسائل کا استنباط کرتا ہے اور وہ خود ایمان اور اخلاص کے اعلیٰ درجہ پر ہے تو بلاشبہ ان کا اجتہاد حق اور صواب پر ہوگا، ان کے ساتھ اکرام اور احترام کا معاملہ ہونا چاہئے، اگر اجتہاد میں ان سے خطا ہوتی ہے تو یہ حقیقت میں اجتہادی خطا ہے، ہمارے اسلاف کا یہی شیوہ رہا ہے، انہوں نے اسی طریقہ پر عمل کیا ہے اور دوسروں کو بھی اسی کا حکم دیا ہے۔

اس کی بہت سی مثالیں ہیں، مثلاً حضرت عمر بن عبدالعزیز فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں اس سے خوشی نہیں ہوگی کہ صحابہ کرام کے درمیان کسی بھی معاملہ میں کسی طرح کا اختلاف نہ رہے، اس لئے کہ اگر وہ کسی حکم پر متفق ہیں، اس کے بعد اگر کوئی قول صحابہ کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ ناکام ونامراد ہوگا، لیکن اگر صحابہ کرام میں اختلاف ہے تو ایک شخص ایک رائے کو اختیار کرے گا اور دوسرا دوسری رائے کو، اس طرح شریعت پر عمل کرنے میں وسعت اور گنجائش باقی رہے گی۔

شافعی علماء سے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے بارے میں یہ منقول ہے کہ اجتہادی مسائل میں سختی کے ساتھ نکیر نہ کی جائے، اور کسی کے لئے درست نہیں ہے کہ وہ ان مسائل میں اپنی رائے پر عمل کرنے کے لئے دوسروں کو مجبور کرے، ہاں ان جیسے مسائل میں علمی دلائل کی روشنی میں بحث کی جائے گی، اور دو اقوال میں سے جس کی صحت راجح نظر آئے اس

---

(۱) سورہ انبیاء: ۹۲ (۲) سورۂ بقرہ: ۲۸۵

کو اختیار کیا جائے گا، پھر جب کوئی دوسری جماعت کی کسی رائے کو اختیار کرے تو اس پر نکیر کرنا صحیح نہیں ہوگا۔

اختلافی مسائل میں صحابہ کا عمل

ہر زمانہ کے بڑے بڑے علماء نے اس موضوع پر بحث کی ہے، اور اس اختلاف کی بنیاد پر تفرقہ اور دشمنی سے منع کیا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اس اختلاف کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی معرکۃ الآراء کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرماتے ہیں: ’فقہاء کے درمیان اختلاف کی اکثر صورتیں اور بطور خاص وہ مسائل جن میں صحابہؓ کے اقوال دونوں طرف ہیں مثلاً تکبیرات تشریق، عیدین کی تکبیر، حالت احرام میں نکاح، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے منقول تشہد، بسم اللہ اور آمین آہستہ کہنا، اقامت کی تکبیر دو دو بار اور ایک ایک بار کہنا اور اس طرح دوسرے مسائل، ان سب میں صحابہؓ کے دونوں اقوال میں سے کسی ایک کو ترجیح دینا ہے، ان مسائل کی اصل مشروعیت میں سلف کا اختلاف نہیں تھا بلکہ ان کا اختلاف اس میں تھا کہ اولیٰ اور بہتر کون ہے، اور اس کی واضح مثال قرأت کے وجوہ و روایات میں قراء کا اختلاف ہے۔

اسی طرح صحابہ، تابعین اور تبع تابعین میں کچھ لوگ نماز میں بسم اللہ پڑھتے اور کچھ نہیں پڑھتے تھے، انہی میں بعض بسم اللہ زور سے پڑھتے اور بعض آہستہ، کچھ لوگ فجر کی نماز میں دعائے قنوت پڑھتے اور کچھ لوگ نہیں پڑھتے، بعض حضرات پچھنا لگانے، نکسیر پھوٹنے اور قے کے بعد وضو کرتے اور بعض ان چیزوں کے بعد وضو نہیں کرتے، بعض مس ذکر اور عورت کو شہوت کے ساتھ چھونے میں وضو کے قائل تھے اور بعض قائل نہیں تھے، بعض آگ پر پکی چیزوں کے کھانے کے بعد وضو کرتے اور بعض نہیں کرتے، بعض اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کرتے اور بعض نہیں کرتے۔

ائمہ فقہ کا طرز عمل

اس طرح کے اکثر مسائل میں فقہاء نے یہ علت بیان کی ہے کہ ان میں صحابہ کرامؓ کا عمل مختلف رہا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سارے صحابہ کرامؓ حق پر تھے، اس لئے ہمیشہ علماء کرام اجتہادی مسائل میں مفتیوں کے فتاویٰ کو جائز قرار دیتے اور قاضیوں کے فیصلوں کو تسلیم کرتے رہے، اور بعض مرتبہ اپنے مسلک کے خلاف رائے پر بھی عمل کیا ہے، ائمہ فقہ کو دیکھئے کہ وہ ان مسائل میں مسئلہ کی تہہ تک جاتے ہیں، اختلاف کو واضح کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں: هذا أحوط (یہ زیادہ احتیاط پر مبنی ہے) هذا هو المختار (یہی پسندیدہ ہے) هذا أحب الي (یہ میرے نزدیک زیادہ بہتر ہے) اسی طرح وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مجھ تک بس یہی روایت پہنچی ہے، اس طرح کی تعبیریں مبسوط، امام محمدؒ کی تصانیف اور امام شافعیؒ کے کلام میں کثرت سے ملتی ہیں۔

ان ائمہ فقہ کے بعد ان کے تلامذہ کا دور آیا، انہوں نے اپنے ائمہ کی آراء کو مختصر کیا، ان کے مابین موجودہ اختلاف کو مدلل بیان کیا اور اپنے ائمہ کے قول مختار پر جم گئے، سلف سے جو یہ بات منقول ہے کہ انہوں نے اپنے مذہب کو اختیار کرنے کی تاکید کی اور یہ کہ اس کی رائے کو کسی بھی حال میں نہ چھوڑا، یہ یا تو فطری تقاضہ کی وجہ سے تھا، کہ ہر شخص کو اپنی قوم اور جماعت کی پسندیدہ چیز، یہاں تک کہ ان کا لباس وپوشاک اور کھانے کی چیزیں بھی محبوب ہوتی ہیں، یا اس وجہ سے تھا کہ ان کے سامنے مضبوط دلیل تھی یا اس طرح کی کوئی اور بات ہوگی، اسی کو بعض لوگوں نے دینی تعصب سمجھ لیا، حالانکہ ان کے اندر دور دور تک یہ بات نہیں تھی۔

اس لئے اختلاف کے باوجود ائمہ فقہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے تھے، مثلاً امام ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ، اسی طرح امام شافعیؒ اور دیگر حضرات مدینہ کے مالکی ائمہ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے، اگرچہ مدینہ کے مالکی فقہاء نماز میں بسم اللہ پڑھنے کے قائل نہیں ہیں جہری نہ سری۔ ہارون رشیدؒ نے پچھنا لگانے کے بعد نماز پڑھائی، ان کے پیچھے امام ابو یوسفؒ نے

نماز پڑھی، اور نماز نہیں دہرائی۔ امام مالکؒ نے بھی ان کی اقتداء کی، چونکہ پچھنا کے بعد وضو کے قائل نہیں تھے جبکہ امام احمد بن حنبلؒ نکسیر پھوٹنے اور پچھنا لگانے کے بعد وضو کے قائل تھے، ان سے پوچھا گیا کہ اگر دوران نماز امام کو خون نکل آئے اور وہ وضو نہ کرے تو کیا اس کے پیچھے نماز پڑھی جائے گی؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں امام مالکؒ اور سعید بن المسیبؒ کے پیچھے کیسے نماز نہ پڑھوں!

امام شافعیؒ نے فجر کی نماز امام ابوحنیفہؒ کے مقبرہ کے پاس ادا کی، اور امام اعظمؒ کے احترام میں دعاء قنوت نہیں پڑھی، آپؒ نے یہ بھی فرمایا: کبھی کبھی اہل عراق کے مذہب یعنی فقہ حنفی کی طرف رجوع کر لیتا ہوں، امام مالکؒ نے منصورؒ اور ہارون رشیدؒ سے اسی طرح کی بات کہی تھی۔

فتاویٰ بزازیہ میں امام ابو یوسفؒ کے بارے میں مذکور ہے کہ انہوں نے حمام سے غسل کر کے جمعہ کی نماز پڑھائی، لوگوں نے آپ کی اقتداء میں نماز ادا کی اور چلے گئے، پھر ان کو معلوم ہوا کہ حمام کے کنوئیں میں مرا ہوا چوہا موجود ہے، اس موقع پر امام ابو یوسفؒ نے فرمایا: اب ہم اپنے بھائی اہل مدینہ کی رائے کو اختیار کر لیں گے کہ جب پانی دو قلہ کو پہنچ جائے تو وہ ناپاک نہیں ہوتا۔

امام خجندیؒ سے ایک شافعی المسلک آدمی کے بارے میں پوچھا گیا، جن کی ایک یا دو سال کی نماز چھوٹ گئی تھی، پھر اس نے امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کو اختیار کر لیا تھا، کہ ایسے شخص پر نماز کی قضاء کس طرح واجب ہے، وہ امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق نماز کی قضا کرے یا امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے مطابق؟ انہوں نے جواب دیا کہ ان دونوں میں سے جس مسلک کے مطابق بھی قضاء کرے جائز ہے بشرطیکہ اس مسلک کے مطابق نماز کے جائز ہونے کا اعتقاد رکھتا ہو۔(۱)

---

(۱) حجۃ اللہ البالغہ، ج ۱، ص: ۴۵۴-۴۵۷

امام ابن تیمیہؒ نے بھی اپنی کتاب ''الالفۃ بین المسلمین'' میں اس طرح کی بات لکھی ہے، وہ تحریر کرتے ہیں:

''تمام سلف مشروع طریقہ پر ہی نماز پڑھتے، دعا اور ذکر واذکار کرتے تھے، ان کے شاگردوں نے اسی طرح ان کے طریقہ کو اختیار کیا۔ اسی طرح ان ائمہ کے اصحاب وعلاقہ کے مسلمان عمل کرتے تھے، کبھی یہ سارے طریقے برابر ہوتے اور کبھی ان میں ایک طریقہ دوسرے سے افضل بھی ہوتا، ان کے بعد جو لوگ آئے، انہوں نے اپنے ائمہ کے اختیار کردہ رائے کو اس لئے قبول کیا کہ امام نے افضلیت کی بناء پر اسے اختیار کیا ہوگا، جبکہ دوسرے لوگوں نے اس کے مخالف رائے کو قبول کیا، یہیں سے ہلاکت خیز اور گمراہ کن نفسانیت کا حملہ شروع ہوا، حالانکہ دونوں طریقے اللہ اور اس کے رسولؐ کے نزدیک برابر تھے، ہر جماعت نے اپنے طریقہ کو افضل سمجھا، جنہوں نے اس طریقہ کی موافقت کی ان کو پسند کیا اور جنہوں نے اس رائے سے اختلاف کیا ان سے اعراض کیا۔ اس طرح ان لوگوں نے ایسے مسائل کو افضل وغیر افضل دو حصوں میں بانٹ دیا جسے اللہ نے برابر درجہ میں رکھا تھا، اور جن مسائل میں اللہ نے صرف افضلیت کا فرق رکھا تھا ان کو ان حضرات نے مساوی درجہ دیا۔

یہ تفرقہ وانتشار اور اختلاف کا ایک مہلک دروازہ تھا جو اس امت میں کھل گیا جبکہ قرآن وحدیث نے اس سے روکا تھا، صحیح حدیث کے مطابق خود نبی کریم ﷺ نے اس اختلاف سے منع فرمایا، جیسا کہ ہم نے ''الصراط المستقیم'' میں ذکر کیا ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اقرء وا کما علمتکم (جیسا ہم نے سکھایا ہے اسی کے مطابق پڑھو) (۱)

اختلاف کے اسباب

شیخ ابن تیمیہؒ اپنی کتاب '' إقتضاء الصراط المستقیم '' میں حدیث نزال کو نقل کرنے کے بعد تحریر کرتے ہیں:

---

(۱) رسالۃ الألفۃ بین المسلمین، ص: ۵۹

امت میں اکثر اختلافات جو ہوائے نفس کو جنم دیتے ہیں وہ اسی قسم کے ہیں، وہ یہ ہے کہ اختلاف کرنے والوں میں سے ہر ایک اپنی بات اور اس کے مستدلات کو درست ٹھہراتا ہے، اور دوسرے کی رائے کی نفی میں غلطی پر ہوتا ہے، جیسا کہ تمام قراء حضرات اپنی قرأت کو درست ٹھہراتے ہیں اور دوسرے کی قرأت کی نفی میں غلطی پر ہیں، اس لئے کہ جہالت عام طور پر اسی نفی میں ہوتی ہے جس کو انکار وتکذیب کے نام سے جانا جاتا ہے، اثبات میں یہ بات نہیں ہوتی، اس لئے کہ انسان جس چیز کو دلائل سے ثابت کرتا ہے وہ نفی کے مقابلہ اس کے لئے زیادہ آسان ہوتا ہے۔

اصل میں اختلاف دو طرح کا ہوتا ہے، اختلاف تنوع اور اختلاف تضاد، اختلاف تنوع کے کئی اسباب ہوتے ہیں:

● مثلاً ایک صورت یہ ہے کہ دونوں اقوال یا دونوں طرح کا عمل مشروع ہو، جیسا کہ قرأت کے سلسلہ میں صحابہ کا اختلاف رہا ہے۔ آپ ﷺ نے صحابہ کو متوجہ کرتے ہوئے فرمایا: 'کلا کما محسن'۔

● اسی طرح اذان کے طریقہ کی مختلف صورتیں، اقامت، امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنا، تشہد، صلاۃ خوف، عید کی تکبیریں، جنازہ کی تکبیریں اور ان کے علاوہ دیگر مسائل ہیں کہ یہ سب مشروع ہیں، بس یہ کہا جاسکتا ہے ان میں بعض طریقے افضل ہیں اور بعض غیر افضل۔

مگر ان مسائل میں امت کے اکثر افراد کے درمیان شدید اختلاف پایا جاتا ہے، اقامت کو دو دو بار کہنے یا ایک ایک بار کہنے اور ان جیسے معمولی مسائل پر جنگ وجدال کی نوبت آجاتی ہے، جبکہ یہ حرام ہے، جو لوگ افسوسناک صورت حال تک نہیں پہونچتے تو عموماً ان کے دلوں میں ان جیسے مسائل میں دوسرے فریق کے خلاف نفسانیت، عصبیت اور دوسرے سے اعراض پایا جاتا ہے۔ اس طرح جس بات سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے منع فرمایا اسی کا ارتکاب کرتے ہیں۔

● ایک صورت یہ ہے کہ دونوں اقوال کا مطلب ایک ہی ہو، صرف تعبیر الگ ہو، جیسے الفاظ کی تعیین، دلائل کے صیغے، مسمیات کی تعبیر، احکام کی تفہیم وغیرہ میں اکثر لوگوں کا اختلاف رہا ہے، پھر جہالت اور ظلم وزیادتی ایک قول کی مدح اور دوسرے قول کی مذمت پر آمادہ کرتی ہے۔

● ایک صورت یہ ہے کہ دونوں کے معانی الگ الگ ہوں، لیکن دونوں ایک دوسرے کے منافی نہ ہوں، لہذا پہلا قول بھی درست ہوگا اور دوسرا بھی، گرچہ پہلے قول کا معنی دوسرے قول سے الگ ہو، اکثر نزاعی مسائل میں ایسا ہی ہوا ہے۔

● ایک صورت یہ ہے کہ دونوں طریقے مشروع ہوں، کسی فرد یا جماعت نے ایک طریقہ کو اختیار کیا، اور دوسرے فرد یا جماعت نے دوسرے طریقہ کو، دونوں کا طریقہ دین میں پسندیدہ ہے، لیکن نادانی وزیادتی نفس ایک کو دوسرے کی مذمت پر، بغیر نیک نیتی یا بغیر علم کے ایک کو دوسرے سے افضل قرار دینے پر اکساتی ہے۔

اس کے بعد امام ابن تیمیہؒ اختلاف تضاد کی تفصیل بیان کرتے ہوئے آگے مزید لکھتے ہیں:

یہ تقسیم جس کو ہم نے اختلاف تنوع کا نام دیا ہے، اس میں دونوں فریق میں سے ہر ایک بلاشبہ حق پر ہے، مگر جس نے دوسرے پر زیادتی کی، وہ قابل مذمت ہے، ان جیسے مسائل میں قرآن نے دونوں جماعتوں کی تعریف کی ہے، بشرطیکہ کسی ایک کی طرف سے نفسانیت یا زیادتی کا دخل نہ ہو، اللہ کا ارشاد ہے:

'وَدَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ اِذْ یَحْکُمَانِ فِی الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِیْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ، وَکُنَّا لِحُکْمِهِمْ شٰهِدِیْنَ۔ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَیْمٰنَ، وَکُلًّا اٰتَیْنَا حُکْمًا وَّعِلْمًا'(۱)

---

(۱) سورہ انبیاء: ۷۸

اسی طرح بنوقریظہ سے جنگ کے موقع پر جن صحابہ نے عصر کی نماز اپنے وقت پر ادا کی اور جنہوں نے بنوقریظہ پہنچنے کے بعد تاخیر سے ادا کی، رسول اللہ ﷺ نے دونوں کو صحیح قرار دیا، رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد بھی اسی معنی میں ہے: جب حاکم اجتہاد کرے اور صحیح حکم تک پہنچ جائے تو اس کے لئے دو اجر ہے، اور جو صحیح حکم تک نہ پہونچ سکے اس کے لئے ایک اجر ہے، اس کی بہت سی نظیریں ہیں (۱)

حافظ جلال الدین سیوطی اپنی تصنیف 'جزیل المواھب فی اختلاف المذاھب' میں تحریر کرتے ہیں:

''مذاہب میں اختلاف اس ملت کے لئے بڑی نعمت اور بڑی فضیلت کی بات ہے، اہل علم اس کے اسرار سے واقف ہیں اور علم نا آشنا اس سے بے خبر، بعض علم نا آشنا لوگوں سے یہاں تک کہتے ہوئے سنا گیا کہ جب نبی کریم ﷺ ایک شریعت لے کر مبعوث ہوئے تو یہ چار مسالک کہاں سے وجود میں آئے؟

اسی طرح یہ بھی حیرت انگیز بات ہے کہ بعض حضرات ایک مسلک کو دوسرے سے اس طرح افضل بتاتے ہیں جس سے دوسرے مسلک کی تنقیص اور اس کا کمتر ہونا ثابت ہوتا ہے، اس کی وجہ سے کبھی ناواقفوں کے درمیان لڑائی جھگڑے کی نوبت تک آجاتی ہے، اور یہ مسالک جاہلی عصبیت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، حالانکہ علماء کو تو ان چیزوں سے پاک ہونا چاہئے۔

خود صحابہ کرامؓ کے درمیان بعض فروعی مسائل میں اختلاف رہا ہے، جبکہ وہ خیر امت تھے، مگر ان میں سے کسی نے دوسرے سے مخاصمت نہیں کی، نہ ایک نے دوسرے سے عداوت کی، اور نہ ہی ایک نے دوسرے کو خطا کار اور غلط وناحق ٹھہرایا۔

اس میں مصلحت یہی ہے کہ ملت کے مختلف مسالک میں اختلاف اس امت کی امتیازی خصوصیت ہے، حضرت محمد ﷺ سے پہلے جو انبیاء مبعوث ہوئے وہ ایک شریعت

---

(۱) اقتضاء الصراط المستقیم لمخالفۃ أصحاب الجحیم، ص: ۵۰-۵۵

اور متعین احکام لے کر آئے، اس لئے ان کے ماننے والوں کے لئے شریعت میں تنگی ہوئی کہ ان میں اکثر فروعی مسائل میں تخییر کی گنجائش نہیں تھی جو تخییر ہماری شریعت میں ہے، جیسے یہود میں قصاص کا، نصاری میں دیت کا، حتمی طور پر لازم ہونا وغیرہ۔

یہ شریعت بہت آسان ہے، اس میں کسی طرح کی تنگی نہیں ہے، جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

'یُرِیدُ اللّٰهُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیدُ بِکُمُ الْعُسْرَ'(۱)

اسی طرح فرمایا:

'وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ'(۲)

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: 'بُعِثْتُ بِالْحَنِفِیَّةِ السَّمْحَةِ'

اسلامی شریعت کی وسعت یہ ہے کہ اس شریعت کے علماء کے درمیان فروعی مسائل میں اختلاف رہا ہے، یہ مسالک اپنے اختلاف کی وجہ سے گویا متعدد شریعتوں کی طرح ہیں، ان سب کے احکام اس واحد شریعت میں ہیں، اس طرح یہ شریعت بیک وقت متعدد شریعتوں کا مجموعہ ہے جسے لے کر آپ ﷺ مبعوث ہوئے۔ اسی لئے اس شریعت میں امت کے لئے بڑی گنجائش ہے۔ یہ نبی کریم ﷺ کی غیر معمولی قدر و منزلت اور دیگر انبیاء پر آپ کی افضلیت کی دلیل ہے کہ ہر ایک کو ایک متعین حکم دے کر بھیجا گیا، اور آپ کو ایک معاملہ میں متعدد احکام ملے۔

یہ لطیف اشارہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وا کیا، جسے اسرار شریعت کا علم اور ذوق ہو وہی اس کی قدر کر سکتا ہے۔(۳)

اہل قبلہ کی تکفیر درست نہیں ہے

لہذا کسی غلطی یا کسی گناہ کے ارتکاب پر کسی مسلمان کو کافر قرار دینا درست نہیں، یہ اہل

---

(۱) سورۂ بقرہ: ۱۸۵ (۲) سورہ حج: ۷۸ (۳) اس عبارت کو شیخ عبد الفتاح ابو غدہ نے امام ابن تیمیہ کی کتاب الالفة بین المسلمین ص: ۷۶-۷۸ کے حاشیہ میں نقل کیا ہے۔

قبلہ کے مابین متنازع فیہ مسائل کی طرح ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

'آمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَانُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ، وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيْرُ' ۔(۱)

اور صحیح مسلم کی روایت سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی اور مومنین کی خطا کو معاف کر دیا۔ یہاں تک کہ ان خوارج سے جن سے رسول اللہ ﷺ نے قتال کا حکم دیا، چوتھے خلیفہ راشد حضرت علیؓ نے ان لوگوں سے جنگ کی اور صحابہؓ وتابعین اور تبع تابعین خوارج سے جنگ کرنے پر متفق تھے، ان کو بھی حضرت علیؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور دیگر صحابہ کرام نے کافر نہیں قرار دیا بلکہ جنگ کے باوجود مسلمان سمجھا۔ مگر جب ان کے ہاتھ مسلمانوں کے پاک وصاف خون سے رنگ گئے، ان کے مال واسباب کو لوٹا گیا تو پھر حضرت علیؓ نے ان سے جنگ کی، لہذا ان سے جنگ کرنا ان کے ظلم وسرکشی کو روکنے کے لئے تھا نہ کہ ان کے کفر کی وجہ سے، اسی وجہ سے ان کی عورتوں کو باندی نہیں بنایا اور نہ ان کے اموال کو مال غنیمت سمجھا۔

جبکہ ان کی گمراہی نص سے ثابت تھی اور صحابہ کا اس پر اجماع تھا، اس کے بعد بھی ان کو کافر نہیں سمجھا گیا، اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم پر ان سے جنگ کی گئی، تو پھر فروعی مسائل میں اختلاف کرنے والی جماعتوں کے بارے میں کیسے کچھ کہا جا سکتا ہے، جبکہ ان میں ان کے مابین صرف یہ شبہ ہے کہ ان سے زیادہ جاننے والا ان میں کون ہیں؟ اس لئے ہرگز کسی جماعت کے لئے جائز نہیں کہ وہ دوسرے کی تکفیر کرے، اور ان کے خون اور مال کو حلال سمجھے، خواہ ان میں صریح بدعات ہی کیوں نہ ہوں، اور جب تکفیر کرنے والے خود بھی بدعات سے خالی نہ ہوں تو ان کی بدعت زیادہ قبیح ہے، بلکہ سچ بات یہ ہے کہ یہ لوگ جن

---

(۲) سورۂ بقرہ: ۲۸۵

مسائل میں اختلاف کرتے ہیں ان کی حقیقت سے نا آشنا ہیں۔(۱)

ملی وحدت اور اسلامی اخوت

علماء سلف کے جو حالات ہمارے سامنے ہیں وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ فروعی مسائل میں اختلاف رائے کے باوجود ہمارے درمیان محبت، ہمدردی اور بھائی چارہ کے جذبات ہونے چاہئے، وہ لوگ اس انداز سے رہتے تھے کہ ان کے درمیان اخوت ومحبت بدرجہ اتم موجود تھی، حالاکہ وہ جسے صحیح اور حق سمجھتے اس پر پوری مضبوطی سے قایم رہتے تھے اور ایسے مسائل میں صرف علمی بحث کرتے تھے۔

اسی طرح جب ہم ائمہ مجتہدین کے حالات پر غور کرتے ہیں مثلاً امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے علاوہ دیگر ائمہ تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ وہ باہم بڑی محبت اور رواداری کا معاملہ کرتے تھے، یہ طرز اخلاق ہمارے درمیان باقی رہنا چاہئے، ورنہ ہر مسلک والے اپنے مسلک کو حق پر اور دوسرے مسلک کو گمراہی پر سمجھنے لگیں گے، پھر ہمارا دین ایک چھوٹے مسلک یا محدود دائرہ میں سمٹ کر رہ جائے گا، یہ ایک چھوٹی جماعت کا دین ہو جائے گا نہ کہ عالمی اور ہمیشہ رہنے والا دین، لہذا ایک عظیم امت کے لئے جس پر ختم نبوت کی مہر ثبت ہو، اور جو اللہ کی شریعت کو قیامت تک جاری ونافذ رکھنے کے لئے آئی ہو اس کے لئے یہ صورت حال کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے۔

اور نہ ہی یہ مناسب ہے کہ چند فروعی مسائل اور استحبابی امور میں اختلاف رائے کو عداوت، بغض وکینہ کا ذریعہ بنایا جائے، جبکہ پوری امت دین کے بنیادی امور میں متفق ہے، سلف کے تمام محققین اس حقیقت کا اعتراف کر چکے ہیں اور سبھوں نے اسے تسلیم بھی کیا ہے۔

---

(۱) رسالۃ الالفۃ بین المسلمین، از شیخ ابن تیمیہ، ص:۸۶

جدید مسائل کا حل
اور علماء کی ذمہ داریاں

دنیاوی مفادات اور مذہبی مصالح میں ٹکراؤ

متمدن زندگی نے سائنسی علوم اور اس کے تحت نئے نئے انکشافات وترقیات کے اثر سے انسانی زندگی میں جدید اور حل طلب ومفید مسائل کھڑے کردیئے ہیں جو تاریخ اسلامی کے سابقہ ادوار کے مسائل سے مختلف ہیں۔ان کے لئے دنیا کے غیر مذہبی دانشوروں نے اپنے دنیاوی مصالح ومفادات کے لحاظ سے جو راہ عمل مناسب سمجھی وہ طے کی اور انسانوں میں جاری کردی وہ چند روزہ دنیاوی زندگی کی راحت ومقصد برآری کے مطابق ہوسکتی ہے لیکن مذہبی نقطہ نظر سے وہ انسان کے مذہبی مصالح ومفادات کے مطابق نہیں ہے بلکہ وہ مذہبی تعلیمات کو مسترد کرکے بنائی گئی ہے اور وہ مذہبی مفادات اور خاص طور پر اسلامی مصالح سے جگہ جگہ ٹکرا جاتی ہے۔

لہذا مذہبی امور کے ذمہ دار حضرات کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اس کو دیکھیں غور کریں اور شریعت کے اصل ماخذ سے استنباط کرکے مسلمانوں کو ان کے سلسلہ میں صحیح شرعی احکام مہیا کریں تاکہ وہ موجودہ تمدنی زندگی کو برتنے میں خلاف اسلام کسی کام کے مرتکب نہ ہوں۔

فقہ اکیڈمی قائم کرنے والوں نے اسی ضرورت کے پیش نظر اکیڈمی قائم کی اور وہ

✦ خطبہ صدارت برائے بارہواں فقہی سیمینار زیر اہتمام اسلامک فقہ اکیڈمی دہلی

الحمدللہ مناسب ڈھنگ سے کام کررہی ہے اس کے موجودہ اجلاس میں موجودہ متمدن زندگی کے تین امور زیرغور لائے جارہے ہیں۔ انٹرنیٹ والیکٹرانک میڈیا، ائمہ فقہ کی آراء کے مابین اختلافات، اور طلاق سکران۔

نصوص میں وسعت معانی کی حکمت

موجودہ تمدنی اور سائنسی ترقیات نے جو نئے وسائل وذرائع مہیا کردئے ہیں ان میں ذرائع ابلاغ کے دائرہ میں الیکٹرانک وسائل وآلات نے تعلیم وذرائع ابلاغ کی راہ میں بڑی سہولتیں پیدا کردی ہیں ان سہولتوں سے جہاں اہل دنیا اپنی دنیاوی ضرورتوں میں کام لیتے ہیں وہاں اہل مذاہب اپنے اپنے مذاہب کی تعلیم وترویج کے لئے اور مذہب دشمن لوگ مذہبی اثرات کو اور خاص طور پر اسلام کو مسلمانوں کی زندگی میں کمزور کرنے کے لئے استعمال کررہے ہیں، اگر ہم ان کے سامنے بے دست وپا رہتے ہیں تو اس کے کیا نتائج نکلیں گے یہ فکر کی بات ہے، شریعت اسلامی نے انسانی ضرورت اور انسان کی طبعی خصوصیات کو سامنے رکھتے ہوئے احکام کے تعین میں جو گنجائش رکھی ہیں ان سے جائز حدود میں فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے، شریعت اسلامی کے احکام کے نصوص میں صریح اور متعین ہدایات رکھنے والے نصوص کے ساتھ ساتھ ایسے نصوص بھی ہیں جن میں احکام کے تعین میں گنجائش نظر آتی ہیں نصوص کا یہ طرز بڑی حکمت پر مبنی ہے کیوں کہ انسانوں کے مزاجوں اور حالات میں جو فرق ہوتا ہے شریعت کی طرف سے وہ بھی جگہ جگہ ملحوظ رکھا گیا ہے اس کی مثال اس بات سے ملتی ہے کہ کئی احکام بتدریج مقرر کئے گئے، اس تدریج میں مزاجوں کی رعایت معلوم ہوتی ہے۔ جیسے شراب کی حرمت ہے کہ بتدریج عائد کی گئی۔ جہاد میں ایک مومن کا دو کافروں کے برابر قرار دیا جانا جو پہلے ایک اور دس کے برابر قرار دئے جانے کے بعد کہا گیا۔

اجتماعی اجتہاد کی ضرورت

انسانی زندگی میں اٹھنے والے نئے سوالات کے سلسلہ میں عہد بدل جانے پر نئے حالات میں پیدا ہونے والے نئے معاملات کے درمیان اور شریعت اسلامی کے احکام کے درمیان انطباق کے معاملہ میں بھی غور وفکر کی ضرورت ہوتی ہے، اپنی علمی فہم کو نئے پیدا ہونے والے معاملات کے سلسلہ میں استعمال کرنا ہوتا ہے جو شریعت کے نصوص و مآخذ کی روشنی میں ہی انجام دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ کام کسی ایک فرد یا دو فرد کے کرنے کا نہیں ہے کیوں کہ ایسے افراد جو اپنی ذہانت کے ساتھ نصوص شرعیہ کو پورے عمق و وسعت کے ساتھ جانتے ہوں موجودہ عہد میں شائد نہ ملیں گے لیکن اجتماعی تبادلہ وخیال سے یہ ضرورت پوری کی جاسکتی ہے۔ اور یہی کام فقہ اکیڈمی کر رہی ہے۔ اس کی ضرورت واہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ فقہ اسلامی کی بہت اہم ضرورت ہے جس کو پورا کر کے دنیا کا یہ قول بالکل باطل ثابت ہو جاتا ہے کہ چودہ سو سال قبل آئی ہوئی یہ شریعت ہر زمانہ کے لئے اور اتنی طویل مدت گزر جانے پر زندگی کے نئے پیدا ہونے والے مسائل کا حل پیش نہیں کر سکتی۔ اگر ہمارے علماء اس ضرورت کو نظر انداز کر دیں گے تو ایک نقصان یہ ہوگا کہ زندگی کے مختلف مسائل ومعاملات میں مسلمان اسی حل کو بے تکلف اختیار کر لیں گے جو مذہب بیزار لوگ ان پر عائد کریں گے کیوں کہ متبادل حل نہ ہونے پر وہ حل اختیار کیا جائے گا جو شریعت کی روح ومزاج سے ہم آہنگ نہیں۔ اس طرح فقہ اسلامی کے یہ ادارے اسلام اور مسلمانوں کی ایک اہم ضرورت پوری کرتے ہیں، ہم ان کے ذریعہ شریعت اسلامی کے دائمی اور ابدی ہونے کی حقیقت کو نہ صرف جاری رکھیں گے بلکہ دوسروں کے سامنے اس کی ابدیت کو ثابت بھی کر سکیں گے۔

اسلامی تاریخ کا موجودہ دور تمدن کے غلبہ کا دور ہے اس تمدن نے زندگی کے مختلف پہلوؤں میں جو ترقی وانکشاف کیئے ہیں ان کے لئے شریعت اسلامی کی طرف سے رہنمائی ضروری ہے یہ ایک انقلابی عہد ہے ایسا انقلابی عہد اسلامی شریعت کو شروع کی صدیوں میں

بھی پیش آیا تھا جب عربوں کو اپنے صحراؤں سے نکل کر فارس وروم کے تمدنی حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس وقت یہ ائمہ فقہ سامنے آئے تھے جن کے بیان کردہ مسائل کی آج دنیا کے اکثر مسلمان پیروی کر رہے ہیں۔ فقہ اسلامی کا اس طرح کا یہ دوسرا چیلنج ہے جو مغربی تمدن کی ترقیات کے اثر سے سامنے آیا ہے اب ہم کو اپنے قدیم ائمہ فقہ کی پیروی میں اس چیلنج کا جواب دینا ہے اور شریعت اسلامی کی ابدیت اور کمال کو ثابت کر دکھانا ہے اور الحمدللہ یہ کام عالم اسلام کے مختلف علاقوں میں کیا جا رہا ہے جس میں ہمارا یہ ہندوستان بھی ہے اور فقہ اکیڈمی اس کام کو انجام دے رہی ہے اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے اور کامیاب بنائے۔ آمین

جدید ذرائع مواصلات سے استفادہ

اب عہد حاضر کے چند تمدنی وسماجی حالات نے کچھ نئے سوالات پیدا کیے ہیں، ان کے لئے ہمارے عہد کے علماء ومفکرین کو شریعت اسلامی کی روشنی میں مناسب جواب دینا ہے۔ ان میں ایک تو آلات ربط اور انٹرنیٹ کا استعمال ہے، ان کو دینی ومذہبی مقاصد میں کس حد تک استعمال کیا جا سکتا ہے؟۔ اور بیع وشراء اور عقود ومعاملات وشہادت کے سلسلہ میں ان سے استفادہ کس حد تک صحیح قرار دیا جا سکتا ہے؟ اور اس سلسلہ میں فقہی لحاظ سے جو شرائط رکھے گئے ہیں وہ کس حد تک پورے ہوتے یا ہو سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اب ترقی یافتہ تمدن اور وسائل ربط وتعلق انسانوں کی عام زندگی میں داخل ہو چکے ہیں، اور ان سے اس طرح فائدہ اٹھایا جانے لگا ہے جس طرح آپس میں براہ راست رابطہ قائم ہونے کی صورت میں ہوتا ہے تو ایسی صورت میں شریعت اسلامی کی روشنی میں عقود ومعاملات کو ان کے ذریعہ کس حد تک عمل میں لایا جا سکتا ہے، جبکہ دیگر تمام پڑھے لکھے حضرات اپنے تمام دیگر ذمہ دارانہ معاملات میں ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

قلب ماہیت کی مختلف صورتیں

قدیم عہد میں مادہ کے عناصر کم تعداد میں معلوم ہو سکے تھے، اور ان کی تحتی خصوصیات بھی محدود تعداد میں تھیں، موجودہ ترقی یافتہ دور کی تحقیق وجستجو سے ان دونوں کی تعداد میں

خاصا اضافہ ہوا ہے، نیز ان کی تحلیل وتجزیہ کے عمل نے بھی بڑی ترقی کی ہے، اس ضمن میں قلب ماہیت کی بھی مختلف صورتیں سامنے آئی ہیں، گندگی اور نجس اشیاء کی تحلیل وتنقیہ کا عمل بھی خاصا ہونے لگا ہے، اور موجودہ زندگی کی مختلف ضرورتوں میں اس کا رواج ہوتا چلا جارہا ہے، لہذا فقہ اسلامی کو اس کے مختلف پہلوؤں اور شکلوں پر نظر ڈال کر شریعت اسلامی کی رہنمائی حاصل کرنا ہے۔

مال زکوۃ سے استفادہ کی نئی شکلیں

زکوۃ سے حاصل ہونے والی رقوم کے مصارف متعین طریقہ سے بتائے گئے ہیں جن پر عمل کیا جاتا ہے، لیکن موجودہ عہد اپنے سابقہ عہد سے بایں طور مختلف ہے کہ قدیم عہد میں جہاں مسلمانوں کی معتد بہ تعداد ہوتی تھی وہاں حکومت مسلمانوں کی ہی ہوتی تھی، وہ حکومت غریبوں کی غربت دور کرنے کی بڑی حد تک ذمہ دار ہوتی تھی، اس طریقہ سے اموال زکوۃ صرف ان لوگوں میں تقسیم ہوتے تھے جو حکومت وقت کی عنایات سے مستفید نہ ہوسکتے تھے، لیکن اب یہ فرق ہوا ہے کہ جہاں مسلمانوں کی حکومتیں نہیں ہیں وہاں بھی مسلمان خاصی تعداد میں ہیں، ان کے تمام دینی وسماجی معاملات خود مسلمانوں کو حل کرنا ہوتا ہے، ایسے ملکوں یا علاقوں میں ان کو صرف عوامی تعاون سے کام چلانا پڑتا ہے، ایسے علاقوں میں عموماً زکوۃ سے زیادہ کام لیا جاتا ہے، لیکن اس کے مصارف متعین ہیں، ان کی پابندی کے ساتھ کیا بعض ایسی شکلیں ہوسکتی ہیں جن میں زکوۃ کے اموال سے عوام مسلمانوں کے معیار کو بہتر بنانے اور ان کے لئے مال زکوۃ سے استفادہ کی نئی شکلیں اختیار کرنے کے مواقع نکالے جاسکتے ہوں، نئے تمدنی نظام میں وہ کون سے موقعے ہوسکتے ہیں جن کو اختیار کرکے اموال زکوۃ سے مزید فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، اور مسلمان عوام کو مزید مالی سہارا دیا جاسکتا ہے؟ غور وتحقیق سے ایسی شکلیں معلوم کی جاسکتی ہیں جو شریعت اسلامی کی تعلیمات سے ٹکراتی نہ ہوں اور مفید اور قابل عمل ہوں۔

جبری شادی پر غور

فقہ اسلامی کے اس سیمینار میں جبری شادی کی مختلف صورتیں بھی جو ملک اور بیرون ملک میں پیش آرہی ہیں، زیر غور لائی جائیں گی، شادیوں میں لڑکے اور لڑکی کا راضی اور متفق ہونا اہم جزء ہے، اسی کے ساتھ ساتھ لڑکے و لڑکی کا خام تجربہ، زندگی اور اشیاء پر نظر کا غیر پختہ ہونا بھی عموماً اس بات کا مقتضی ہوتا ہے کہ ماں باپ کو اللہ تعالیٰ نے بچوں کے سرپرست و خیر طلب ہونے کے باعث رہنمائی اور توجہ دہانی کا جو حق دیا ہے اس کو عمل میں لایا جائے، اور یہ ضرورت مخلوط ماحول میں جیسا کہ یورپ میں یا اس کی نقل کرنے والے مشرقی ممالک میں ہے زیادہ بڑھ جاتی ہے، اور بعض وقت اسلام و ایمان پر باقی رہنے اور اس سے محروم ہو جانے کا مسئلہ سامنے آجاتا ہے، ایسی صورت میں جبر کی حد کیا ہونا چاہئے؟ یا ماں باپ کو کیا حکمت اختیار کرنا چاہئے؟ اس بات کو مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لے کر طے کرنا ہوگا کہ زوجین کی زندگی کی خوش دلی اور راحت کا بھی انتظام ہو، اور ان کے دینی واخلاقی کردار و مقام کو بھی نقصان نہ پہونچے، یہ معاملہ بہت غور و فکر کا ہے، اسے بہت سوچ سمجھ کر حل کرنا ہوگا۔

حضرات! شریعت اسلامی کی پیروی کا مسئلہ ہمارے دین وایمان کا بنیادی مسئلہ ہے، اس کو ہماری تمدنی و ثقافتی وانتظامی ضرورتوں سے ہم آہنگ بنانے کا کام وحی الٰہی کے ذریعہ حاصل شدہ ہدایات کو نظر انداز کرتے ہوئے نہیں کیا جا سکتا، وحی الٰہی اور سنت نبوی کے ذریعہ حاصل شدہ ہدایات میں اگر کوئی ہدایت ہماری محدود سمجھ کے دائرہ میں کسی وقت نہ آتی ہو تو بھی اس سے انکار یا اس کو بدلنے کی کوشش ہمارے ایمانی فریضہ کے خلاف ہوگا۔ حریت فکر و عمل کے جو نظریات یورپ نے ہم کو دیئے ہیں، اور زندگی کے جن معاملات کو زندگی کی لازمی ضرورتوں میں قرار دیا ہے، اور مساوات کا جو تصور ہمارے سامنے پیش کیا ہے ہم کو ان کا بھی جائزہ لینا ہوگا کہ وہ انسان کی عمومی ضرورت نیز دین کے

متعینہ پیمانوں سے کہاں تک ہم آہنگ ہیں، ہم کو آنکھ بند کرکے ان کی صدائے بازگشت نہیں بننا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہم کو اپنی نئی ضرورتوں کے مناسب حل معلوم کرنا ہے، اور ان کے سلسلہ میں ذہنوں میں اٹھنے والے سوالات کا قابل اطمینان جواب بھی پیش کرنا ہے۔ اس کام کو ہمارے موقر علماء شریعت سے اپنی گہری واقفیت کی مدد سے انشاء اللہ بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔

سماجی خدمات کے لئے وقف کا قیام

تیسرا موضوع سماجی خدمات کے لئے وقف قائم کرنے کا مسئلہ بھی اسی سے بڑی حد تک وابستہ ہے، اور اس میں جو ہمدردی اور انسانوں کی تکلیفات دور کرنے کا عمل ہے وہ ایک دوسرے کے دل میں ایک دوسرے سے تعلق اور انس کو بڑھانے والا ہے، اور جب آپسی انس و محبت میں اضافہ ہوگا تو انسانی معاشرہ ایک خیر پسند معاشرہ بنے گا، انسانوں کی جو سماجی انجمنیں بیماروں اور پریشان حال لوگوں کی ہمدردی کرتی ہیں، اور دکھ درد دور کرنے کے لئے جو مدد دیتی ہیں ان کو سب ہی اچھی نظر سے دیکھتے ہیں، خواہ ان کا مذہب اور وطن کوئی بھی ہو، اور ایسی انجمنیں قائم کرنا اور چلانا مسلمانوں کا ایک اہم فریضہ بنتا ہے، اس کے لئے اگر وقف قائم کیا جاسکتا ہو تو اس کام میں مزید مدد مل سکتی ہے۔ اور اس کے لئے کوشش اور تعاون کرنا چاہئے۔

جلاٹین کا مسئلہ فقہی عمل کا مسئلہ ہے، حلال وحرام کے شرعی پیمانوں سے اس کو ناپنا فقہی کوشش کا ایک حصہ بنتا ہے، اس کو فقہ کے ماہرین جلاٹین کے اجزاء سے واقف حضرات سے تبادلۂ خیال سے حل کرسکتے ہیں۔

فتوی کی نزاکت اور مفتی کی ذمہ داریاں

دین کی حفاظت کا وعدہ اور تحریف کی ناکام کوششیں

بھائیو! عزیزو اور بزرگان گرامی!

یہ مجلس (افتتاحی نشست) الحمد للہ اختتام پذیر ہورہی ہے، آپ نے اس میں ماہرین فقہ اور علمائے حق کے تجربے اور مشورے سنے، اور آپ کے لئے رہنمائی ہوئی کہ اس تربیتی نظام سے آپ کیا فائدہ اٹھائیں؟ سب سے بڑا فائدہ آپ کے سامنے جو بتایا گیا وہ یہ کہ فقہ کے سلسلہ میں ہمیں اپنی فکر کو درست کرنا ہے، فقہ کیا ہے؟ اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ اس کام کو کرنے کے لئے کن صلاحیتوں کی ضرورت ہے؟ اور کس مشق کی ضرورت ہے؟ اور یہ بات ظاہر کی گئی کہ یہ کوئی آسان مسئلہ نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے اس کام کو کرنے لگے، یا اگر ایسی آزادی لوگوں کو حاصل ہوجائے تو ہمارا دین بدل جائے گا، مسخ ہوجائے گا۔ اس طرح کی مثالیں آپ کے سامنے آتی رہتی ہیں، عالم اسلام میں بعض ایسے حضرات ابھرتے رہتے ہیں کہ جو نئے مسئلے بتادیتے ہیں اور جمہور امت کے خلاف فیصلے دے دیتے ہیں اور ان کے کچھ ماننے والے بھی تیار ہوجاتے ہیں، جو ان کے علم وفضل کے قائل ہیں، وہ ان کی بات کو مان لیتے ہیں اور اس پر عمل شروع کردیتے ہیں، اس طریقہ سے اگر اس پر عمل عام ہوجائے تو پھر دین میں تحریف قرار پائے گی اور دین بدل جائے گا۔

✦ خطاب: سہ روزہ فقہی ورکشاپ، زیر اہتمام المعہد العالی للقضاء والافتاء، دار العلوم ندوۃ العلماء

اس دین کو اللہ تعالیٰ نے آخری دین بنایا ہے، حضورؐ پر نبوت کے اختتام کا مطلب یہ ہے کہ اس دین کی جو شکل آپ نے متعین فرمادی ہے وہ اختتامی ہے، یعنی اس میں کوئی تغیر نہیں ہوسکتا، قیامت تک یہ دین اس شکل میں چلے گا، اور چونکہ اللہ نے قرآن مجید کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے، یہ سب قرآن کریم ہی سے ماخوذ ہے، اسی سے نکلا ہے، اسی لئے اس دین کے لئے بھی حفاظت کا وعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے گویا ہوگیا ہے۔ اس دین میں تحریف کی کوششیں بہت کی گئیں، تاریخ بتاتی ہے جس سے نئے نئے فرقے وجود میں آئے، لیکن وہ فرقے چل نہیں سکے، اور دین اپنی صحیح حالت میں برابر جاری ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اس دنیا میں دین کا معاملہ ہو یا دنیا کا وہ اپنے حکم سے انجام دلواتا ہے۔ لیکن انہی وسائل واسباب کے ذریعہ سے جو اللہ نے دنیا میں پیدا کئے ہیں۔

فتویٰ دینا بڑی ذمہ داری کی بات ہے

دین کی حفاظت یا دین کے متعلق دین کو جاری رکھنے اور دین کی خدمت کے وسائل کیا ہیں؟ انسان ہیں، علماء ہیں، جو دین کو سیکھتے ہیں، ان کے ذریعہ سے دین کی حفاظت ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو پیدا کرتا رہا جو دین کو تحریف سے بچاتے رہے، اور دین کو صحیح حالت میں رکھتے رہے، یہ بڑی دیانت داری اور امانت داری کا کام ہے اسی طرح مسئلہ بتانا، فتویٰ دینا یہ بہت ذمہ داری کا کام قرار پاتا ہے، چونکہ مسئلہ بتانے کے بعد یا فتویٰ دینے کے بعد اس پر عمل کیا جاتا ہے، اس لئے بڑی ذمہ داری عائد ہوجاتی ہے، اس شخص پر جو فتویٰ دیتا ہے۔

فتوی سے متعلق بعض غلط فہمیاں

فتویٰ کے معاملہ میں خاص طور سے ہمارے اس ملک میں بعض پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں، فتوے کے متعلق غیر قوموں میں غلط خیال پیدا ہوگیا ہے، اور فتویٰ کو وہ یہ سمجھتے ہیں

گویا کہ عدالت کے کام میں مداخلت ہے۔ بعض لوگوں نے یہ الزام لگایا اور وہ الزام چل رہا ہے اور جس کی صفائی دینے کی کوشش کی جارہی ہے، یہ اس وجہ سے ہے کہ ہم نے صحیح طور پر اس بات کو واضح نہیں کیا کہ فتوے کا کیا مطلب ہوتا ہے اور فتویٰ کس دائرہ میں کام کرتا ہے؟

استفتاء کا پس منظر بھی جاننا چاہیے

یہ بھی ہے کہ فتویٰ لینے والوں کے متعلق فتویٰ دینے والے کو اندازہ نہیں ہوتا کہ فتویٰ کیوں لے رہا ہے؟ اور اس کا کیا پس منظر ہے؟ مثلاً ایسا شخص فتویٰ لینا چاہتا ہے کہ جو فتوے پر یقین نہیں رکھتا، وہ فتویٰ کیوں لے رہا ہے؟ ظاہر ہے کہ اسے غلط استعمال کرنے کے لئے اور بدنام کرنے کے لئے لے رہا ہے، تو ہم سمجھتے ہیں کہ مفتی کو یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ فتویٰ لینے والا کون ہے؟ اس کا پس منظر کیا ہے اور یہ فتویٰ کیوں لے رہا ہے؟ عمل کرنے کے لئے لے رہا ہے یا محض اس کو ایک مسئلہ بنا دینے کے لئے یا اس سے جھگڑا پیدا کرنے کے لئے لے رہا ہے۔ فتویٰ تو اسی لئے ہوتا ہے کہ فتویٰ لینے والا اس پر عمل کرے اس کو جو پیچیدگی پیش نظر ہے اور جس کی وجہ سے وہ سمجھ نہیں پا رہا ہے کہ ہمیں کیسا عمل کرنا چاہئے تو وہ مفتی سے فتویٰ لیتا ہے، کہ ہمیں کس طرح عمل کرنا چاہئے، کیا اس میں شریعت کا حکم ہے؟ عمل کرنے کے لئے وہ کرتا ہے، چاہے اس کی مرضی کے خلاف ہو، لیکن پھر بھی اس پر عمل کرے گا اس لئے کہ وہ اس پر ایمان رکھتا ہے۔ ایسے کو فتویٰ دینے میں کوئی نقصان نہیں ہے۔ اس لئے کہ جو فتویٰ دیا جائے گا وہ اس پر عمل کرے گا۔

مفتی کی دو ذمہ داریاں

فتویٰ دینے میں دیانتداری اور امانتداری یہ ہے کہ وہ صحیح مراجع سے رجوع کر کے ایسا فتویٰ دے کہ جو صحیح ہو اور اس میں کوئی غلط بات نہ ہو۔ اس طرح فتویٰ دینے میں کوئی حرج نہیں، لیکن بعض وقت مستفتی ایسا آدمی ہوتا ہے جس کو اندر سے فتویٰ پر عمل کرنے کا کوئی

سوال نہیں، بلکہ کسی اور مقصد سے وہ فتوی لیتا ہے تو مفتی کو اس معاملہ میں احتیاط کرنی چاہئے۔ یہ بے احتیاطیاں ہوئیں جس کی وجہ سے ہمارے ملک میں اس امت کو مسائل پیش آئے اور دشواریاں بھی پیش آئیں اور فتویٰ بھی بدنام ہوا۔

دوسری بات یہ ہے کہ فتویٰ الزامی نہیں ہوتا ہے، اس ملک میں مسلمانوں کی حکومت نہیں ہے کہ جو فتویٰ دیا جائے اس پر عمل بھی کرادیا جائے اور یہ دارالقضاء اسی لئے قائم کیا گیا ہے کہ اگر دونوں فریق راضی ہوں تو ان سے عمل کرایا جائے تو اس ملک کی جو پوزیشن ہے اور جو حالات ہیں اس کو سامنے رکھنا چاہئے اور جیسے بات کہی گئی کہ فتویٰ دینے کے لئے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ دینے کی ضرورت ہے۔

حالات زمانہ اور نفسیّات سے واقفیت

حدیث شریف میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص نے ننادوے آدمیوں کا قتل کیا تھا اور وہ پوچھنے گیا ایک بزرگ سے، ایک بزرگ سے اس نے دریافت کیا۔ ہمارے لئے کیا توبہ ہے؟ وہ بزرگ بزرگ تھے لیکن وہ مفتی نہیں تھے۔ فتویٰ دینے کے مقام میں نہیں تھے۔ انہوں نے کہا تمہارے لئے کیسے توبہ ہوسکتی ہے تم نے اتنا بڑا جرم کیا ہے انہوں نے ان کو بھی شہید کردیا، اس لئے کہ ہماری توبہ جب قبول ہی نہ ہوگی تو ہم مجرم ہیں۔ جہاں ننادوے کا قتل کیا تو سو سہی۔ اس کے بعد پھر ہوک اٹھی تو اس نے ایک عالم دین سے جو فتویٰ دینے کے مقام میں تھا اس سے جا کر پوچھا تو اس نے کہا ہاں توبہ ہوسکتی ہے۔ حدیث شریف میں یہ واقعہ اسی لئے بیان کیا گیا۔ آدمی کو فتویٰ دینے میں آدمی کو اس صورت حال کا جائزہ بھی لینا چاہئے اور نتائج بھی سامنے رکھنے چاہئے۔

عام علماء کو فتوی دینے میں احتیاط کرنا چاہیئے

اسکا یہ مطلب نہیں کہ شریعت کے حکم کو بدل دیں لیکن شریعت کے حکم کو سمجھنے میں اور

شریعت کے حکم کی روح کو جاننے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اس کی روح کو سمجھے بغیر ظاہر ہے غلطی ہوسکتی ہے تو فتویٰ دینے والے کو اتنا تیار ہونا چاہیئے۔ایسی ٹریننگ لینی چاہیئے تربیت لینی چاہیئے۔فتویٰ دینے کی جو صلاحیت ہے یا استحقاق ہے وہ اس میں پیدا ہو جائے اور جو علماء کے پاس لوگ فتویٰ لینے آجاتے ہیں، کسی عالم کے پاس آجاتے ہیں اس عالم کو احتیاط کرنا چاہیئے، اگر وہ مفتی نہیں ہے تو اس کو کہہ دینا چاہیئے کہ مفتی صاحب کے پاس جایئے، مفتی صاحب سے فتویٰ لیجیئے ہم مفتی نہیں ہیں۔اگر یہ احتیاط ہو تو اس احتیاط سے انشاءاللہ بہت سی خرابیاں دور ہو جائیں گی۔

جو لوگ بھی فتویٰ کا کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں ان کو یہ صلاحیت پیدا کرنے کی ضرورت ہے، اس کے لئے ٹریننگ کی اگر ضرورت ہو تو ٹریننگ لینی چاہیئے اور فتوے کے لئے جو مصادر ہیں ان مصادر سے ایسا ربط پیدا کرنا چاہیئے کہ آسانی کے ساتھ ان مصادر تک رجوع کرسکیں اور اس کے بعد وہ فتوے دے سکیں۔

ہمارا یہ جو پروگرام ہو رہا ہے، تین روز کا، اس میں ظاہر ہے کہ پوری تربیت تو ہو ہی نہیں سکتی، تین دن ایسی کوئی حد نہیں ہے، لیکن اس میں رہنمائی ہوسکتی ہے، ذہن سازی ہوسکتی ہے اور جو بنیادی اور ضروری معلومات ہوتی ہیں وہ بھی سامنے لائی جاسکتی ہیں۔اور اس رہنمائی کے نتیجہ میں اس طرف آگے قدم بڑھایا جاسکتا ہے، اور ترقی کر کے اپنے کو اس مقام تک پہنچایا جاسکتا ہے۔

اللہ سے دعا ہے کہ اس پروگرام کو مفید سے مفید تر بنائے اور جو حضرات آئے ہیں وہ کوئی فکر لے کر جائیں، جس فکر کی اس کام میں ضرورت ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العلمین

موجودہ حالات کے مقابلہ کیلئے علم میں رسوخ اور مطالعہ میں وسعت کی ضرورت

بھائیو! عزیزو!

آپ نے بہت مفید باتیں سنیں، اور آپ کی رہنمائی بہت اچھے طریقہ سے کی گئی، جو باتیں آپ نے سنی، تقریروں میں یا مقالات کے ذریعہ سے، اس کو آپ اپنے ذہن میں محفوظ رکھیں، یہاں سے وہ توشہ لے کر جائیں تب یہ پروگرام کامیاب کہلائے گا، اور اگر آپ نے ان باتوں کو سنا اور یہیں چھوڑ کر چلے گئے اور ذہن میں ان کو نہیں بٹھایا تو یہ پروگرام ناکام کہلائے گا۔

علمی رسوخ اور یکسوئی کی ضرورت

ہمارے اسلاف کا طریقہ بہت زیادہ علمی محنت کا رہا ہے اور بہت یکسو ہو کر انہوں نے محنتیں کی ہیں، آپ ﷺ امی تھے اور تہذیب وتمدن نے جو ترقی کی تھی اور جو علمی ترقیات ہوئی تھیں ایران میں اور روم وعراق میں اس سے وہ بالکل بے خبر تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ دین عطا فرمایا اور انہوں نے دین کو پھیلایا دنیا میں تو ایک بڑا علاقہ دنیا کا خاص طور سے متمدن علاقہ ان کے اختیار میں آ گیا۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ زندگی کے کیسے کیسے مسائل ہیں، زندگی کی کیسی کیسی مشکلات ہیں، اور تنظیم ونظام زندگی کو قائم کرنے کے لئے کن کن

☆ خطاب: سہ روزہ فقہی ورکشاپ، زیر اہتمام المعہد العالی للقضاء والافتاء، دار العلوم ندوۃ العلماء

وسائل اور کن کن اسباب کی ضرورت ہے، ان کے سامنے بالکل ایک دنیا کھل کر سامنے آ گئی، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو توفیق دی انہوں نے وسائل کا حل اسلام کی روشنی میں، قرآن وحدیث کی روشنی میں نکالا اور پوری زندگی کے جو سوالات تھے سب کا حل پیش کر دیا اور غیر معمولی سنجیدگی کے ساتھ غیر معمولی فکر اور توجہ کے ساتھ یہ کام کیا جس کی تاریخ آپ کے سامنے ہے، اور انہی حضرات کی محنتوں کا آج تک ہم اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، اور اسی کی روشنی میں ہم اسلامی زندگی کو چلا رہے ہیں، لیکن انہوں نے جس طرح محنت کی اس کو آپ دیکھیں تو حیرت ناک صورت آپ کے سامنے آئے گی، کس طرح استغراق کے ساتھ، کس طرح توجہ اور فکر کے ساتھ انہوں نے مسائل کی تحقیق کی اور مسائل کی تعیین کی، اور اس کے حل پیش کیے، ان کو آپ کتابوں میں دیکھ سکتے ہیں اور سچی بات یہ ہے کہ علم ایسے ہی یکسو ہو کر محنت چاہتا ہے اور جو علم بغیر یکسو ہوئے اور بغیر محنت کے حاصل کیا جاتا ہے وہ علم پختہ نہیں ہوتا، اور وہ حالات کا مقابلہ اور وسائل کا جواب بھی نہیں دے سکتا۔

مشرق کی غفلت اور مغرب کی بیداری

مسلمانوں میں جب انحطاط پیدا ہوا ان کے سامنے سارے مسائل کا حل آ گیا اور ساری محنت جو بزرگوں نے کی تھی اور اسلاف نے کی تھی، ان کے سامنے ایک پکی پکائی چیز کی حیثیت سے آ گئی تو مطمئن ہو گئے اور پھر ایسا دور آیا کہ مسلمانوں نے کوئی خاص محنت نہیں کی، پھر اسی دولت کو جو علمی دولت ان کو حاصل ہوئی تھی اپنے اسلاف سے، اسی کے اردگرد چکر لگاتے رہے، اور انہوں نے آگے بڑھنے کی اور کوئی نئی چیز پیش کرنے کی کوشش نہیں کی اور اسی درمیان میں یورپ میں نشأۃ ثانیہ ہوئی، اور انہوں نے مسلمانوں کے یہاں سے لے کر علم کو آگے بڑھایا، علمی تحقیقات کی، اور افسوس کی بات یہ ہے کہ انہوں نے ہمارے علوم دینیہ میں محنت کی، تفسیر میں محنت کی، فقہ میں محنت کی، حدیث میں محنت کی، انہوں نے ایسا لٹریچر تیار کر دیا جس میں ہمارے مذہب کو، اسلام کو منہدم

کرنے کا پورا مواد تھا، اور ہم غافل رہے، ہم نے توجہ بھی نہیں کی، اور ان کے غلبہ کی وجہ سے جب ان کے لٹریچر نے ساری دنیا کو متاثر کردیا، تو ہمارے سامنے یہ خطرہ آیا کہ ہم اسلام کی حقانیت کو کس طرح ثابت کریں، اور اسلامی احکام کی درستگی کو کس طرح ثابت کریں، اور کس طرح ہم یہ بتائیں کہ اسلام نے ہم کو ایسی شریعت دی ہے، ایسا نظام دیا ہے کہ جو انسان کی مشکلات کا حل پیش کرتا ہے، جو انسان کے مزاج وفطرت کے بالکل عین مطابق ہے، اس کو ہم کیسے ثابت کریں، اس لئے کہ وہ سارا لٹریچر دنیا میں عام ہو چکا، جو ان لوگوں نے پیدا کیا، لیکن لٹریچر کس طرح پیدا کیا، آپ خیال تو کیجئے! کہ انہوں نے دوسرے مذہب کی چیزوں پر گہری محنت وسخت محنت کر کے اس میں سے وہ چیزیں نکالنے کی کوشش کی، جس سے لوگوں کے ذہنوں کو گمراہ کر سکتے ہیں، اس لئے انہوں نے محنت کی۔

جدید شبہات اور خطرات کے مقابلہ کے لئے ٹھوس مطالعہ کی ضرورت ہے

اب مسلمانوں میں شعور پیدا ہو گیا ہے، اور علم کی طرف وہ بڑھ رہے ہیں، لیکن اب بھی مسلمانوں میں وہ محنت اور وہ فکرمندی اور یکسوئی نہیں پائی جاتی، اس کی بڑی کمی ہے، ہم اپنے مدارس کو دیکھتے ہیں، ہمارے سامنے ان کا نقشہ ہے، کہ محنت کرنا، اور یکسوئی کے ساتھ علم حاصل کرنا، علم پر وقت صرف کرنا، یہ تقریباً مفقود ہے، اور سرسری مطالعہ، سرسری معلومات حاصل کر لینا اور اس پر مطمئن ہو جانا، اور اسی سرسری علم کو لے کر آگے بڑھنا اور خطرات کا مقابلہ اسی محدود علم سے کرنا عام شیوہ ہو گیا ہے۔

مخالفین نے جو اشکالات پیدا کر دیئے ہیں، جو شبہات پیدا کر دیئے ہیں، اس کا ہم ٹھیک سے مقابلہ نہیں کر سکتے، اس لئے کہ ہمارے پاس وہ ٹھوس معلومات نہیں ہیں، ہمارا ٹھوس مطالعہ نہیں ہے، ہم میں تحقیق کرنے کا اور محنت کرنے کا جذبہ نہیں، ہم عام ثقافتی چیزوں میں لگے

ہوئے ہیں، ہم جلسے خوب کر لیتے ہیں، تقریریں خوب سن لیتے ہیں، لیکن یکسو ہو کر کسی موضوع پر ہم محنت کریں اور اس میں ہم کوئی نئی بات سامنے لائیں اور ایسی بات، ایسی ٹھوس بات کہ جس سے ہم یہ جو خطرات اس وقت درپیش ہیں، ہم پر ہر طرف سے جو حملہ ہو رہا ہے، اس کا ہم جواب دے سکیں، یہ اس وقت بڑی کمی کی بات ہے۔

سرسری مطالعہ کافی نہیں

آپ ایک محدود دائرہ میں رہتے ہیں، آپ کو معلوم نہیں کہ اس وقت اسلام پر کیسا نرغہ ہے، اور اسلام کو کس طرح غیر انسانی مذہب ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، اور اسلام میں وہ کوتاہیاں دکھانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ جس سے اسلام کو کوئی بھی ہو اس کو مسترد کردے گا، اور کہے گا کہ یہ زمانہ کے ساتھ نہیں چل سکتا، یہ ہماری کوتاہی کا نتیجہ ہے، ہم بیدار تو ہوئے ہیں لیکن ابھی ہمیں یکسو ہو کر، علم یکسوئی چاہتا ہے، علم فکرمندی چاہتا ہے، علم ہر چیز سے منقطع کر کے اپنے میں مشغول کر لیتا ہے اور یہ بات ہم میں بالکل نادر ہو گئی ہے۔ ہمارے طلباء بھی سرسری درس پر اکتفاء کرتے ہیں، اور ہر طرح کی مشغولیتوں میں ان کا جی لگتا ہے، لیکن علم پر جو یکسوئی کے ساتھ محنت کرنے کی ضرورت ہے وہ ہم میں بہت کم ہے، اس طریقہ سے ہم ان خطرات کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں، ہم ان لوگوں کی محنتوں کا جنہوں نے یکسو ہو کر اپنے اپنے مطلب اور فائدہ کے علم میں محنت کی ہے، اور علمی تحقیقات کی ہیں، ان کا ہم مقابلہ اپنے سطحی علم سے نہیں کر سکتے۔

علم وتحقیق یکسوئی چاہتا ہے

علم وتحقیق کے لئے جو صفت چاہئے اور جو یکسوئی چاہئے وہ ہم میں نہیں ہے، امام غزالیؒ کا قول ہم برابر پڑھتے ہیں 'العلم لا یعطیك بعضه إلا إذا اعطیته كلك وإنك من أن یعطیك بعضه علىٰ خطر' وہ کہتے ہیں کہ اپنے کو بالکل کھپا دو علم کے اندر تو بھی تم

ضروری نہیں کہ تھوڑا علم حاصل کرسکو، جب تک آدمی اپنے کو علم میں کھپا نہ دے، ہر چیز سے منھ موڑ لے، جلسہ ہورہا ہے، جانے کی ضرورت نہیں، کوئی پروگرام ہورہا ہے ہونے دے، جو اس کے خاص فائدہ کا نہیں اس کو نظرانداز کرے وہ اپنے علم کے ساتھ اپنے کو مربوط رکھے اور اپنے سارے اوقات کو اس میں کھپادے، جب تک یہ نہیں کرے گا وہ اس مقام پر آکر عظیم خطرات کا مقابلہ نہیں کرسکتا ہے، ان حملوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا، جو حملے ہورہے ہیں، ہم اس کا منھ توڑ جواب نہیں دے سکتے، ہم اس کا مقابلہ اسی وقت کرسکتے ہیں جب اپنے کو علم میں کھپائیں، اور ساری دلچسپیوں سے منھ موڑ لیں، اور طبیعت کو خوش کرنے والی جو باتیں ہیں، ان سے ہم اپنے کو ہٹالیں، ہم بالکل سنجیدگی کے ساتھ بلکہ اپنے کو پریشانی میں مبتلا کر کے بھی محنت کریں۔

اسلاف کے سرمایہ سے فائدہ اٹھائیں

ہمارے اسلاف نے کس طرح علم حاصل کیا تھا، ایک ایک حدیث کے لئے انہوں نے لمبے لمبے سفر کئے اور اس حالت میں سفر کئے تھے کہ نہ ان کے پاس کھانے کو کچھ تھا، نہ رہنے کے لئے کوئی ٹھکانہ تھا، مسجد میں پڑ گئے ہیں، اور سوکھی روٹی کھا رہے ہیں، اور یہ کس لئے، یہ اس لئے کہ ایک حدیث ان کو حاصل کرنی ہے، انہوں نے اس محنت سے یہ سرمایہ جمع کیا ہے، جس سرمایہ کو اب پڑھنے کے لئے اور سرمایہ سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہمارے پاس وقت نہیں ہے، ہمیں یہ حوصلہ نہیں ہے کہ ہم اس سرمایہ سے پورا فائدہ اٹھاسکیں، ایسے میں ہم کیا کام کرسکتے ہیں۔

ہمارا دین اس وقت نرغہ میں ہے، ہماری شریعت نرغہ میں ہے، اس پر جو اشکالات پیدا کئے جارہے ہیں، احتمالات پیدا کئے جارہے ہیں، اس کو مجروح کیا جارہا ہے، اس کا مقابلہ ہم اسی وقت کرسکتے ہیں، جب ہم شریعت سے اور علوم دینیہ سے گہری واقفیت رکھتے

ہوں اور گہری واقفیت کے لئے ہمیں اپنے وقت کو کھپانا ہوگا، اور ساری دلچسپی سے منھ موڑنا ہوگا، صحیح طالب علم وہی ہے کہ جو اپنی دلچسپیوں سے منھ موڑ لے اور صرف سنجیدہ اور بالکل بے مزہ کام میں اپنے کو لگائے۔

مزاج کو بدلنے کی ضرورت ہے

ایک بات تو مجھے یہ کہنی ہے کہ ہمیں اپنا رویہ بدلنا ہوگا، چاہے سیمینار ہوں، چاہے جلسے ہوں، ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ ہم اس سے کتنا فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اس فائدہ کے لئے اپنے اصل ذہن کو مرکوز کرنا ہے، دلچسپی کو ملتوی کر دینا ہے، دلچسپی کے لئے بعد میں زمانہ آئے گا، پھر آدمی دلچسپی کی باتیں کر لے گا، طالب علمی میں کوئی دلچسپی کی ضرورت نہیں۔

انتشار سے بچیں اور اجتماعیت کو فروغ دیں

دوسری بات یہ ہے کہ جو علمی طور پر جنہوں نے فراغت حاصل کر لی ہے، اور علمی کاموں میں اب وہ لگے ہوئے ہیں، خاص طور پر فقہ کے کاموں میں، افتاء کے کاموں میں، اس بات کو بھی سامنے رکھنا چاہئے کہ جب ایسے خطرات ہوں دین کے لئے اور امت کے لئے اس وقت ہمیں ایسی باتوں سے پرہیز کرنا چاہئے، جس سے انتشار پیدا ہو، ہم لوگوں کا ایک مرض ہے، انفرادیت اور تفرد، ہمارے سمجھ میں جو بات آگئی ہے، بس وہی اصل ہے اور ہم اسی کی نشر و اشاعت کرنے لگیں گے، نتیجہ یہ ہوگا کہ انتشار پیدا ہو جائے گا، ہمیں اجتماعی رائے کو اہمیت دینی چاہئے، اجتماعیت کے خلاف ہمیں کوئی رویہ نہیں اختیار کرنا چاہئے، جس بات پر اجتماعیت ہو چکی ہے، اجماع ہو چکا ہے، اس کے اندر ہمیں کوئی انفرادی رائے ظاہر نہیں کرنی چاہئے۔

اپنے کو بہت فاضل نہیں سمجھنا چاہئے، کتنا ہی فاضل ہو جائے لیکن 'وفوق کل ذی علم علیم' آدمی کا علم کم ہی ہے، یہ کبھی غرور پیدا نہیں ہونا چاہئے کہ ہم صاحب علم ہو گئے،

ہم صاحب الرائے ہوگئے، اگر ہم تواضع کے ساتھ، اور کم علمی کے احساس کے ساتھ محنت کریں گے تو ہمارا علم بڑھے گا، ہماری حیثیت بڑھے گی، اور ہم یکسو ہو کر اپنے اصل موضوع پر انہماک کے ساتھ لگ جائیں گے تو ہماری قدر ہوگی، اور ہماری بات کو وزن کے ساتھ، بات کا وزن محسوس کیا جائے گا، سننے والا کہے گا، کہ ہاں انہوں نے محنت کی ہے اور یہ اس محنت کے لحاظ سے ان کی بات کی قدر کرنی چاہئے اور سرسری کام کرنے سے آدمی کی قدر نہیں ہوتی۔

دو باتیں

اور دو باتوں کی فکر کریں: ایک تو علم کے ساتھ گہرا تعلق پیدا کریں، اور فقہ کا مطلب یہی ہے، فقہ کا مطلب صرف پڑھ لینا نہیں ہے، بلکہ اسے توجہ اور غور سے بات کو سمجھنے کی کوشش کرنا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اپنے کو کم علم ہی سمجھیں، اپنے کو بہت صاحب علم نہ سمجھیں، اور اپنی انفرادی رائے پر اڑیں نہیں، اور اس کو فتنے کا باعث نہ ہونے دے، ان چیزوں کا خیال رکھنے کی ضرورت ہے، اگر آپ ان چیزوں کا خیال رکھیں گے تو انشاء اللہ آپ فقہ کا بھی حق ادا کریں گے اور امت کی ضرورت کو بھی پورا کر سکیں گے، اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے، اور ہمارے اس پروگرام کو جو تین روز ہوا قبول فرمائے، اس کے بہتر ثمرات عطا فرمائے اور اس میں جو باتیں پیش کی گئی ہیں اور جو رہنمائی کی گئی ہے وہ آپ اپنے ذہنوں میں بٹھائیں اور اس سے جو فائدہ آپ نے اٹھایا ہے اس فائدہ کو آپ قائم رکھیں، آئندہ اس کے مطابق اپنی زندگی کو آگے بڑھائیں۔

وآخر دعوانا أن الحمدلله رب العالمين۔

مسلم اور غیر مسلم تعلقات اور امن عالم

حضرات! ہندوستان جیسے ملک میں جو مسلم آبادی کے لحاظ سے دنیا کے ملکوں میں نمبر ۲ پر ہے لیکن مسلمان یہاں اقلیت میں ہیں، اور ملک کا دستور سیکولر ہے، اس اکیڈمی کی بڑی اہمیت ہے، اور یہ اس ملک کے مسلمانوں کے فقہی رہنمائی کا جلیل القدر کام انجام دے رہی ہے۔ آج کے سیمینار میں مسلم اور غیر مسلم تعلقات، اسلام اور امن عالم، اہم سماجی خدمات کے لئے وقف کا قیام، جلاٹین اور دیگر کیمیاوی اشیاء کا حکم زیر غور آرہا ہے۔ یہ چار موضوعات ہیں، ان میں اول الذکر تین موضوعات ملکی اور بین الاقوامی زندگی سے تعلق رکھنے والے معاملات ہیں اور یہ دراصل فکر اسلامی کے دائرہ میں آتے ہیں جو عہدِ حاضر کی زیرِ عمل تمدنی وسیاسی زندگی کے سرگرم ملکی وبین الاقوامی حالات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور چوتھا موضوع حلال وحرام کے شرعی احکام کے دائرے میں آتا ہے، جو اکیڈمی کا اصل دائرۂ فکر وتحقیق ہے، جبکہ اول الذکر تین موضوعات میں موجودہ جمہوریت، آزادی اور مساواتِ عامہ کے مروجہ نظامِ زندگی کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ یہ جدید زیرِ عمل نظامِ زندگی قدیم نظام زندگی سے بہت مختلف ہے۔

✦ خطبہ صدارت ۱۴واں فقہی سیمینار، زیر اہتمام اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

دارالکفر اوردارالاسلام کی حد بندی کی بنیاد

پہلی بات تو یہ ہے کہ گزشتہ عہد کا نظامِ زندگی غلامی وفوجی طاقت کا تابع تھا، اور ایک طبقہ و مذہب کا دوسرے طبقہ اور مذہب پر برتری کا حق رکھنے والا نظام زندگی تھا۔ اس میں حاکم اعلیٰ کو ڈکٹیٹر کی حیثیت حاصل ہوتی تھی، اور مذہبی وطبقاتی دائروں میں بھی اسی کو تصرف واختیار کا حق حاصل ہوتا تھا، لہذا ملک کے باشندے اس سابق نظام مین صرف حاکم کے رجحان اور مذہب کے تابع ہوتے تھے، دوسرے کسی مذہب کو اگر رعایت ملتی بھی تھی تو وہ محدود طرز کی ہوتی، اس طرح کے سیاسی نظام میں اسلامی نقطۂ نظر سے دارالاسلام اوردارالکفر کی حد بندی کی ضرورت سمجھی گئی۔

ملکی نظام اور آزادیٔ مذھب

جہاں اسلامی اقتدار ہو اس کو دارالاسلام اور جہاں یہ اقتدار نہ ہو اس کو دارالکفر کہتے، دارالکفر کہے جانے والے ملک میں اسلامی تعلیمات پر عمل نہیں ہوسکتا تھا اس لئے اس کو دارالکفر کی اصطلاح سے موسوم کیا جاتا اور وہاں اسلام پر عمل نہ کرسکنے کی وجہ سے وہاں سے دارالاسلام کی طرف منتقلی ضروری قرار دی جاتی تھی تاکہ دین پر عمل کرنے میں رکاوٹ نہ رہے اور اسلامی تعلیمات پر عمل کی سہولت حاصل ہو، لیکن موجودہ عہد میں نظام حکومت کی سابقہ صورت نہیں رہی، اب عموماً شخصی آزادی اور جمہوری وعوامی مساوات کا نظام قائم ہے، اس میں کسی فرد کی دوسرے افرادِ وطن پر برتری تسلیم نہیں کی جاتی۔ اور نہ حاکمِ ملک اپنے رجحان ومذہب کو اپنے عوام پر عائد کرتا ہے، کوئی متعین مذہب دوسرے مذہب والوں پر لازم نہیں کیا جاتا، ہر مذہب والے کو اپنے مذہب کے دائرہ میں قائم رہنے کی اجازت ہوتی ہے، اور دوسرے کے مذہبی دائرہ پر اپنی رائے چلانے کا حق تسلیم نہیں کیا جاتا، مذہبی مسئلہ ملک کے افراد کا اپنا نجی مسئلہ قرار دیا جاتا ہے، البتہ انتظامی اور شہری معاملات میں عوام کے نمائندوں کے طے کردہ دستور اور قانون کی پابندی کرنا ہوتی ہے، اور اسی دستور کے مطابق

چلنا ہوتا ہے، اس میں کسی مذہب یا ثقافت کے کچھ معاملات اگر ملک کے نظام اور قانون سے ٹکرائیں تو ان کے لئے بات چیت اور قانونی لحاظ سے حل نکالنے کی کوشش کی جاسکتی ہے، باقی امور جو دستور کے تحت آتے ہیں ان کی پابندی کرنا ضروری ہوتا ہے، لیکن علی العموم انفرادی زندگی سے تعلق رکھنے والے اور وہ سماجی معاملات جو مذہب ثقافت یا طبقاتی اصولوں کے تحت آتے ہوں ملک کے شہری کو اپنی رائے اور پسند کا اختیار اور اجازت ہوتی ہے، لیکن ملک کے دستور کے طے کردہ معاملات میں الگ رائے تسلیم نہیں کی جاتی، اس طرح دنیا کا ہر ملک جو موجودہ جمہوری اصولوں پر مبنی ہو ایک دائرہ میں دارالاسلام میں حاصل ہونے والے مذہبی حقوق کو عموماً منع نہیں کرتا ہے، اور دارالحرب کی رکاوٹوں جیسی رکاوٹ نہیں رکھتا ہے، اور مذہب کی پابندیوں کو تسلیم نہیں کرتا، اور اب یہ نظام صرف غیر مسلم ملکوں میں ہی نہیں بلکہ اسلامی نام نہاد ملکوں میں بھی پایا جارہا ہے، اس کو سیکولر نظام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے جس میں حکومت کو اپنے عوام کے مذہبی امور سے سروکار رکھنا نہیں ہوتا، اس صورت میں پہلے موضوع کے لحاظ سے مسلم اور غیر مسلم کے تعلقات مساویانہ اور آپسی تعاون کے ہونے ضروری سمجھے جاتے ہیں، اور اسلامی نقطۂ نظر سے اس میں کوئی مذہبی رکاوٹ نہیں، لیکن اگر مذہبی رکاوٹ ہو تو ہر مذہب والے علیحدہ علیحدہ حل اختیار کرسکتے ہیں، اور اپنے مذہب وثقافت کے مطابق زندگی گزار سکتے ہی، اس بات کی ان کو پوری آزادی ہے، لیکن اگر کسی کے مذہبی معاملہ کا ملکی نظام اور دستور سے ٹکراؤ ہوگا، یا وطنی رشتہ سے کسی کی آزادی اور مساوات کے خلاف ہوگا تو وہاں اس کے مذہبی امور پر عمل میں رکاوٹ ہوگی، ایسے نظام میں مسلم اور غیر مسلم کے مساوی ہونے کی بناء پر وطن کا ہر باشندہ دوسرے باشندہ کا وطنی بھائی قرار دیا جاتا ہے، اور دونوں یکساں مرتبہ اور حقوق کے حامل ہوتے ہیں، اس صورت حال کے عام ہوجانے کی بنا پر غیر اسلامی ملک دارالکفر کے دائرہ میں نہیں آرہے ہیں، اور اسلامی ملک اسلام کے عدم نفاذ کی وجہ سے دارالاسلام نہیں قرار پاتے، اس طرح صورت حال دونوں اصطلاحوں سے باہر ہوجاتی ہے۔

شریعت کے تحفظ اور جدید مسائل کے حل کیلئے دو ادارے

اس صورت حال میں ملک کے دائرہ میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ایک شہری پر عائد ہوتی ہیں ان کو ہم اسلام کے حقوق انسانی کے دائرہ میں رکھتے ہوئے جو فرائض وحقوق انسانی وحدت کے دائرہ میں آتے ہیں، ان میں ہم کو مملکت کے اختیار کردہ اصولوں کو اپنانے میں دشواری نہیں، اور یہ حقوق وذمہ داریاں زیادہ تعداد میں اسلام کی ہدایات کے اندر آجاتی ہیں، اور جو بچ جاتی ہیں ان میں ہماری حیثیت مجبوری کی ہے، اور اس مجبوری کا کوئی خاص بدل اس وقت موجود نہیں، کیوں کہ اسلامی تعلیمات پر مکمل عمل کی سہولت مسلم اقتدار رکھنے والے ملکوں میں بھی نہیں، مزید یہ کہ کسی ملک کو دارالکفر قرار دے کر وہاں کے باشندوں کی کسی دوسری جگہ منتقلی قابل عمل نہیں۔ البتہ ایسے نظام میں مسلمانوں کے اپنے مذہبی عمل کے جاری رکھنے کے لئے دو اداروں کی ضرورت ہوتی ہے، ایک شریعت کے تحفظ کا ادارہ جو مذہبی احکام پر عمل کے اختیارات کے بقاء اور جو اختیارات روکے گئے ہوں ان کے حصول کے لئے قانونی ودستوری کوشش کی ذمہ داری انجام دے۔

دوسرا ادارہ فقہ اسلامی کے جدید مسائل کے لئے کہ بدلتی ہوئی زندگی اور نظام زندگی میں ابھرتے ہوئے فقہی سوالات کا حل قرآن وحدیث اور ائمہ فقہ کی آراء کی روشنی میں پیش کرے، اور الحمدللہ ہمارے ملک میں یہ دونوں ادارے آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ اور اسلامک فقہ اکیڈمی کے نام سے قائم ہیں اور اپنی مؤقر ذمہ داریوں کو انجام دے رہے ہیں۔

مسلم اور غیر مسلم تعلقات

زیر غور پہلے موضوع یعنی مسلم اور غیر مسلم تعلقات کے بارے میں دیکھا جائے تو ہم کو انسانی اخلاق وحقوق کے اسلامی اصولوں سے مثبت رہنمائی ملتی ہے، قرآن مجید کی آیت ہے کہ

يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَٰكُمْ شُعُوبًا

وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا، اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللّٰهِ اَتْقٰكُمْ(۱)

اور اسلام میں پڑوسی کے جو حقوق بتائے گئے ہیں ان سے بھی مسلم اور غیر مسلم کے درمیان اچھے تعلقات رکھنے کے معاملہ میں بڑی روشنی ملتی ہے، اور ہمارے اسلاف کا کردار بھی قرآن وحدیث کی روشنی میں اسی کے مطابق ملتا ہے، جس کو اختیار کرنے پر ہم غیر مسلموں کے ساتھ پوری ہمدردی اور رواداری کا برتاؤ کرسکتے ہیں، اور ان کے ساتھ اپنے تعلقات کو اچھا بناسکتے ہیں، اور جہاں تک ایک دوسرے کی تکلیف دور کرنے کا اور اچھا سلوک کرنے کا تعلق ہے تو اسلامی تعلیمات میں جانوروں تک سے اچھا برتاؤ کرنے اور برے برتاؤ سے گریز کرنے کا صراحۃً حکم آیا ہے، ایک پیاسے کتے کو پانی پلانے پر جنت اور ایک بلی کو بھوکا پیاسا رکھ کر مار ڈالنے پر جہنم ملنے کا ذکر آیا ہے، تو اسلامی رشتہ وتعلق نہ ہونے کے باوجود پڑوسی ہونے کے تعلق سے اور جاندار مخلوق ہونے کے تعلق سے حسن سلوک کا جب حکم آیا ہے تو ایک ملک میں ایک ساتھ رہنے والے مسلم اور غیر مسلم کے مابین تعلق میں پڑوسی ہونے کا تعلق، اور کم از کم انسانی تعلق اور ذی روح کے ساتھ حسن سلوک کا حق ہونے کا تعلق بہر حال پایا جاتا ہے، اور حضور ﷺ کی حیات طیبہ میں غیر مسلم کے ساتھ حسن سلوک کی مثالیں ملتی ہیں، اس لئے مسلم اور غیر مسلم کے ساتھ انسانی ہمدردی کا برتاؤ کرنا اور کمزور وضرورت مند کی رعایت کے تقاضوں کو پورا کرنا اور پڑوسی کے حق کا خیال کرنا اسلام کی تعلیمات کے خلاف نہیں۔ البتہ محبت اور قلبی وجذباتی لگاؤ غیر مسلم کے ساتھ صحیح نہیں، اس لئے کہ صحیح عقیدہ وعمل صالح کے مفقود ہونے کی وجہ سے قلبی لگاؤ اور محبت کی گنجائش نہیں ہے، صرف ظاہری ہمدردی اور عام انسانی اخلاق ہی کافی ہے۔

پرامن بقائے باہم اسلام کا پسندیدہ طریقہ

اسلام میں انسانی ہمدردی اور انسانوں کو تکلیف سے بچانے کی جو ترغیب دی گئی ہے اور

---

(۱) سورۂ حجرات:۱۳

جس سلوک کے سلسلہ میں ہر ذی روح کے ساتھ ہمدردی کرنے پر ثواب کی امید دلائی گئی ہے، اس پر وسیع سطح سے عمل کیا جائے تو امن عالم کے قیام میں اسلام کا حصہ زیادہ نمایاں نظر آئے گا، اسلام میں تو اس بات کا بھی خیال رکھنے کی تلقین کی گئی ہے کہ راہ میں کہیں کوئی ایسی چیز پڑی ہو جس سے راہ چلتے کسی کو ایذا پہنچ سکتی ہو تو اس کو ہٹادے، ظاہر ہے کہ راہ چلنے والا مسلم بھی ہوسکتا ہے اور غیر مسلم بھی۔ اپنے خاندان کا بھی ہوسکتا ہے اور غیر خاندان کا بھی۔ اپنے پیشے کا بھی ہوسکتا ہے اور کسی دوسرے کے پیشے کا بھی۔ اپنے ملک کا بھی ہوسکتا ہے غیر ملک کا بھی۔ تو اس ہمدردی کا خیال رکھنے کی تاکید کی صورت میں پوری انسانی برادری کے ساتھ پر امن بقائے باہم کا طریقہ اسلام کا پسندیدہ طریقہ ثابت ہوتا ہے، اور جہاں تک امن عالم کا تعلق ہے تو جو بات مسلم اور غیر مسلم تعلقات کے سلسلہ میں ابھی عرض کی گئی ہے اگر اس پر عمل ہو تو یہی وسیع دائرہ میں امنِ عالم کا بھی ذریعہ بن جاتا ہے، اس صورت میں امن عالم کے قیام میں مدد خواہ اجتماعی انداز سے کی جائے یا انفرادی سطح سے کی جائے اسلام کی نظر میں پسندیدہ فعل ہے، بلکہ امن عامہ میں مدد کرنے سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ امن کو بگاڑنے والوں کے ساتھ اسلام میں سخت کارروائی کا حکم ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے

'مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا، وَ مَنْ اَحْیَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا' (۱)۔

امن عالم کا قیام اور مسلمانوں کی ذمہ داری

ان باتوں کو دیکھا جائے تو امن عالم کے قیام کی طرف توجہ زیادہ تر اسلام ہی میں ملتی ہے، اور خاص طور پر مسلمانوں پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے لیکن یہ کام تنہا مسلمانوں کے اختیار میں نہیں ہے، اس کی فکر دیگر لوگوں پر بھی عائد ہوتی ہے، اور امن کو بگاڑنے والے

(۱) سورہ مائدہ: ۳۲

کو امن خراب کرنے سے روکنا بھی ضروری ہے، اور یہ صحیح ہے کہ اس کی ذمہ داری مسلمانوں پر بھی آتی ہے، لیکن ظلم کا انتقام لینا بھی مظلوم کا حق بتایا گیا ہے، اور یہ انتقام دراصل ظلم کو روکنے اور امن کو مضبوط بنانے کا ذریعہ ہوتا ہے، اس انتقامی عمل کے استثناء کے ساتھ امن ورواداری کے ساتھ زندگی گزارنا امن عالم قائم کرنے کا معاون بنتا ہے۔

دہشت گردی کی مخصوص ومتضاد اصطلاح

اور رہی دہشت گردی کی اصطلاح تو اس اصطلاح کو اختیار کرنے والوں نے اس کے مفہوم کو اپنی مصلحت اور خود غرضانہ مقاصد کے ساتھ مخصوص کر رکھا ہے، اس اصطلاح کو وہ صرف اپنے ہی ناپسندیدہ لوگوں کے لئے استعمال کرتے ہیں، اسرائیل کے ظلم وبربریت کے خلاف فلسطینی افراد غصے میں آکر کچھ کرتے ہیں تو اس اصطلاح کے ذریعہ ان کو مطعون کیا جاتا ہے۔ اسی طرح دنیا کے اور خطوں میں مسلمانوں کے ساتھ بربریت کی جاتی ہے تو کچھ نوجوانوں کے بے قابو ہوجانے سے جو انتقامی صورت پیدا ہوتی ہے، اُس کی بناء پر ان مسلمان مظلوموں کو متہم کیا جاتا ہے اور ان کو ہر ظلم پر صبر کرنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ حالانکہ حکومتوں کی طرف سے عوام کی آواز کو دبانے کے لئے ان پر جو زبردستی اور ظلم کیا جاتا ہے وہ بھی دہشت گردی کہلانے کا مستحق ہے۔

اور امنِ عالم کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اسی وقت قائم ہوسکتا ہے جب حکومتی سطح سے کی جانے والی دہشت گردی کو بھی ختم کیا جائے اور یہ صرف عوام کے بس میں نہیں ہے، البتہ عوام اس ذہنیت کو رواج دینے کی کوشش کریں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اور دیگر تمام مخلوقات کو پیدا کیا اور ان کے امن اور سلامتی کا نظام بنایا اور مقرر کیا، جس کی رو سے اگر ہر ایک اس کا التزام رکھے کہ اس کی طرف سے دوسرے کو تکلیف نہ پہونچے، اور اس کی طرف سے دوسرے کے ساتھ زیادتی نہ ہو، اور دوسرا بھی یہی اہتمام رکھے، اور حکومتیں بھی اس کی طرف خصوصی توجہ کریں کہ ظالمانہ جبر وتشدد کی کارروائیوں سے گریز کریں تو دنیا میں امن وسلامتی قائم ہونے میں کوئی مانع نہ ہوگا، اور امن عالم قائم ہوجائے گا۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔

مروجہ سودی نظام اور اسلامی تعلیمات

موجودہ اقتصادی زندگی میں بینکنگ نظام، انشورنس اور دیگر مالی واقتصادی معاملات کی غیر معمولی اہمیت ہے، یہ نظام مشرق ومغرب میں اسی طرح پھیل چکا ہے کہ مالی معاملات، اقتصادی سرگرمیوں میں حصہ لینے والا کوئی بھی اپنے معاملات کو اس سودی نظام سے بچانا بھی چاہے تو نہیں بچا سکتا۔

موجودہ زمانہ میں بینک سب سے زیادہ نفع بخش ومستحکم نظام، اور مال کے محفوظ رکھنے کا سب سے قابل اطمینان اور بھروسہ مند ذریعہ شمار کیا جاتا ہے، پھر بینک کی طرف سے مختلف سہولتوں، طویل مدتی یا قلیل مدتی قرضے دئے جانے، اس کی وجہ سے بینک سے فائدہ اٹھانا موجودہ معاشرہ کی اقتصادی ترقی کے لئے لازم ہوگیا ہے، اور اب لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اس سوی نظام سے بچنا اور سود کے بغیر معاملات کرنا مشکل اور دشوار کام ہے، اس کے بغیر تجارت نہیں بڑھ پائے گی، بلکہ زندگی کی گاڑی رک جائے گی، اس لئے اس کے بغیر ترقی کرنا اور معاشی نفع فراہم کرنا ممکن نہیں ہے، یہ اس نظام کا ایک پہلو ہے۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جو شخص اللہ ورسولؐ پر ایمان رکھتا ہے، اور زندگی کے تمام معاملات بشمول عبادات ومعاملات واخلاق شریعت کے احکام اور رسول اللہ کی تعلیمات کا پابند ہو، اس کے لئے مذکورہ مالی نظام سے فائدہ اٹھانے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ سودی نظام ہے، ایک طرف بینکنگ نظام سے فائدہ اٹھانا، انسانی ضرورت ہے دوسری

طرف سود حرام ہے اور اس سے مسلمانوں کو روکا گیا ہے، ان اسباب کی وجہ سے لوگوں کی نظر ایسی حتمی رائے اور شرعی توجیہ کی تلاش میں ہے جو اس رکاوٹ کو حل کر سکے، اس معاملہ کی اہمیت اور نزاکت کو دیکھتے ہوئے علماء و دانشوران اور مسلم محققین نے اس موضوع پر علمی مطالعہ اور فقہی تحقیق کے لئے سیمینار اور علمی مجلسیں منعقد کرنا شروع کر دیا ہے۔

قرآن کریم اور احادیث نبویہ میں سود کی صاف حرمت آئی ہے، اس سلسلہ میں واضح احکامات موجود ہیں، اس لئے شریعت کی روشنی میں اس کے جواز کے لئے کوئی حل ڈھونڈھنے کی گنجائش نہیں ہے، سوائے اس کے کہ دار الحرب اور اس جیسے ملکوں کے حالات علماء نے ایک طرح سے گنجائش دی ہے اور بینک کے سود کو لینے اور بلا نیت ثواب غرباء اور ضرورتمندوں میں تقسیم کرنے کی اجازت دی ہے، جب کہ بینک یہ نفع روپیہ جمع کرنے والے کے مطالبہ کے بغیر دے، اور روپیہ جمع کرنے والوں کو یہ اندیشہ ہو اگر اس نفع کو بینک میں چھوڑا گیا تو اسے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف خرچ کیا جائے گا۔

اس سے قطع نظر کہ یہ دونوں حیلے مسلمانوں کو یورپ کے سودی نظام سے فائدہ اٹھانے کی راہ میں حائل مشکلات کو حل کرتے ہیں اور ان کی ضروریات کو پوری کرتے ہیں یا نہیں کرتے، اس موضوع پر تحقیق کرنے والوں کے لئے یہ سمجھنا ضروری ہے ان تمام مالی اداروں کو مغرب نے چند خاص مقاصد کے لئے اور خاص جذبے کے تحت قائم کیا ہے، ان مالیاتی اداروں سے وہ اس کی تکمیل چاہتے ہیں، اس لئے یہ سمجھنا درست نہیں ہوگا کہ یہی ہمارے مالی مشکلات کا حل اور اقتصادی کمزوری کا علاج ہے، اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ بینک اور مغرب کے دوسرے اقتصادی ادارے سرتاپیر سود میں ڈوبے ہوئے ہیں، یہ دراصل لوگوں کی ضروریات اور ان کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے کی، اور انہیں غلام بنانے کی بدترین صورت ہے اور طبعاً بھی یہ ہمدردانہ اور پاکیزہ جذبات سے نہ

صرف دور ہیں بلکہ وہ صحیح انسانی جذبات کے خلاف جذبات رکھتے ہیں، اس باطل نظام کو قائم کرنے کا مقصد خالص مادی نفع ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔

وہ تمام اقتصادی نظریات اور سیاسی فلسفہ جو کمیونزم کے پرداختہ اور سیکولرزم کی گود میں پلے ہیں، اور جن کی بقاء وطنی آزادی سے مختلف رجحانات وافکار، قومی نفع اندرونی میں مضمر ہے، یہ سب کے سب مذہب بیزاری اور حشر ونشر کے انکار پر قائم ہیں، یہ اسلامی عقائد، اسلامی روح اور اسلامی افکار کے صاف معارض ہیں۔ اسلام آسمانی مذہب اور ربانی دین ہے جو ہر اعتبار سے کامل ہے اور انسان کی تمام ضرورتوں اور تقاضوں کو کامل طور پر پورا کرنے والا ہے، لہذا یہ کسی طرح بھی مغربی تصورات اور اس کے لادینی افکار سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتا، یہ الگ بات ہے کہ مغرب کا یہ خیال ہے کہ مذہب اسلام کا دور ختم ہو چکا، بلکہ اس سے بڑی بات یہ کہ وہ اسلام کو ختم کرنا چاہتا ہے اور اس کے خاتمہ کے درپے ہے، مگر ان سب کے باوجود بعض تجدد پسند محققین مغربی تمدن سے متعلق موجودہ مسائل ومشکلات کو مغربی نظریات اور زندگی ومعاشرہ سے متعلق اس کی قائم کی ہوئی بنیادوں کے دائرہ میں حل کرنا چاہتے ہیں، یہ دراصل جدید ذہن کو مطمئن کرنے اور یہ ثابت کرنے کے لئے ہے کہ اسلام ہر زمانہ کا ساتھ دے سکتا ہے، اس کی ترقیوں کے دوش بدوش چل سکتا ہے ظاہر ہے کہ یہ طرز اسلوب صحیح نہیں ہے اور یہ انداز اللہ اور رسول کو قطعی خوش کرنے والا نہیں ہے۔

زندگی سے متعلق مغربی فلسفہ دراصل انقلاب فرانس اور اس وقت کے خاص حالات کی پیداوار ہے، یہ نظریات پوری دنیا پر چھا چکے ہیں اور موجودہ انسانی زندگی کے مختلف گوشوں میں اس کی بڑی اہمیت ہے، یہ حقیقت ہے کہ مغرب کی آئیڈیالوجی اور اس کے نظریات مذہب دشمنی کے باوجود انسان کی مکمل آزادی اور نفع اندوزی کی بنیاد پر قائم ہے، مادی نفع کا حصول اس کا بنیادی اور حقیقی مقصد ہے، اس کی مذہب دشمنی کمیونزم کی وجہ سے ہے، اور اس کی اباحت پسندی، بے حیائی اور اخلاقی انارکی اور مادی نفع کا مزاج، موقع پرستی

وغیرہ یہ سب استعماریت، بینک کے نظام اور دیگر معاشی اداروں کی راہ سے آئی ہیں۔

سود اور جوا اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے اور اس میں مادی نفع اندوزی کا مزاج پایا جاتا ہے اس کی وجہ سے یہ مغربی تہذیب کی اہم بنیادوں میں سے ہے اور اس کی اقتصادی سرگرمیوں میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ اقتصادی نظام سود اور اس کے اثرات سے محفوظ ہو، خواہ اس کا عنوان جو بھی ہو، اور اس پر جیسا لیبل چسپاں کیا جائے، اور یہ بات اس لئے بھی ہے کہ یہ تہذیب سود اور جوا کو کوئی گناہ، معصیت، مہلک مرض اور انسانی معاشرہ کے لئے لاعلاج بیماری نہیں سمجھتی ہے، خواہ اس کی وجہ سے ملک کی اقتصادیات کو جو بھی نقصان پہنچے۔

مغرب کے اس سودی نظام کا سب سے بڑا مظہر اور لالچی طبیعت کی آسودگی کا سب سے بڑا وسیلہ خود ساختہ آسمان سے باتیں کرتا بینک کا نظام ہے، جس نے سود کو خوب خوب پھیلایا، بینک کا یہ جال گاؤں، دیہات اور شہر ہر جگہ پھیلا ہوا ہے جو مادی فائدہ مال جمع کرنے اور بلا مشقت مال بڑھانے کی بنیاد پر قائم ہے، اس طرح بینک کا نظام ہر جگہ قائم ہوا، اور اس کی طرف سے مختلف کام کے لئے بڑی بڑی رقمیں بطور قرض ملنے اور تجارت اور مالی معاملات میں سہولیات فراہم ہونے کی وجہ سے مسلمان بھی اس نظام سے فائدہ اٹھانے پر مجبور ہو گئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بینک کا نظام اور اس کے سارے معاملات کھلے طور پر شریعت کے خلاف ہیں، اس لئے بعض لوگوں نے مسلمانوں کو اس دلدل سے نکالنے اور اس کی جگہ مباح اور مشروع نظام کو پھیلانے کی کوشش کی ہے، اور بلاشبہ یہ لوگ ظاہری سود سے مسلمانوں کو بچانے میں کامیاب بھی ہوئے ہیں، لیکن وہ معاشرہ سود کی باریک اور متنوع شکلوں سے نہیں بچا سکے جبکہ یہ بھی ممنوع ہے، ان حضرات نے اس کے لئے مختلف شہروں میں بلاسودی بینک کا نظام قائم کرنے کی کوشش کی، مگر یہ بھی اپنے نظام کو سودی نظام سے

پوری طرح الگ نہیں رکھ سکے۔

بینک کا مغربی نظام دراصل سود حاصل کرنے اور اس کو فروغ دینے کا ذریعہ ہے، مثلاً رسول اللہ ﷺ نے شراب کی حرمت کے بعد شراب کے برتنوں کو استعمال کرنے سے بھی منع فرمادیا، یہ سد ذریعہ کی وجہ سے تھا، اس طرح آپ نے ایک عمیق حکمت کی طرف اشارہ فرمایا، وہ یہ کہ یہ برتن شراب کی یاد دلائے گا، اور شراب پینے پلانے پر طبیعت کو آمادہ کرے گا، اس لئے یہ بھی حرام، لہذا جو چیز حرام تک پہونچائے وہ بھی حرام سمجھی جائے گی۔

بینک کی سرگرمیوں کا پورا نظام سود کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ بہت آسان اور سہل الحصول ہے، اور انسانی معاشرہ موجودہ اقتصادی ترقی کے لئے معاون اور ضروری ہے، اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اسلامی بنیادوں پر غیر سودی بینکنگ نظام بھی اس سودی نظام سے تعلق رکھنے اور معاملات کرنے پر مجبور ہے، سودی نظام نے اس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کردی ہیں۔

دور حاضر کا بینکنگ نظام سودی معاملات کو بڑا خوش کن، آسان اور سہل الوصول بنا کر جدید معاشیات اور انسانی معاشروں کے لئے لازم وضروری قرار دیتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ غیر سودی نظام جو دینی اصول اور اسلامی بنیادوں پر قائم ہے وہ سب اس کے ساتھ معاملات کرنے پر مجبور ہیں۔ اور سودی نظام غیر سودی نظام کے سامنے مختلف رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے، جس سے اس کی ترقی کی راہیں مسدود ہوجاتی ہیں، اور عالمی بینکنگ تعلقات کے پیش نظر کہیں نہ کہیں جا کر دونوں میں تصادم ہوجاتا ہے۔ اس طرح یہ غیر سودی نظام سودی نظام کے سامنے سپر ڈال دیتا اور اس کے ضوابط کو من وعن تسلیم کرلیتا ہے۔ یہ صرف بینک کے ساتھ خاص نہیں بلکہ یورپ کی تمام اقتصادی اور مالی ادارے یورپ کے سود اور جوا پر مشتمل نظام کے تابع ہیں اور یہ سودی نظام مغربی تہذیب کے لئے گوشت پوست کی حیثیت رکھتا ہے۔

اب معاملہ اس حد تک آگے بڑھ چکا ہے کہ مسلمانوں کے پاس جو بھی مال پہونچتا ہے وہ کسی نہ کسی مرحلہ میں سود سے ضرور مس ہوکر آتا اور کم ہی اس سے محفوظ رہتا ہے، یہ صورت حال مسلمانوں کے لئے قلق واضطراب کا باعث ہے، لیکن اسلام اور مسلمانوں کے لئے یہ کوئی نئی صورت حال نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ نے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوىٰ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوحىٰ (۱)

صدیوں قبل یہ ارشاد فرمادیا کہ ایسا زمانہ بھی آئے گا جب سود خوری عام ہوجائے گی، دریافت کیا گیا کیا سب لوگ سود کھائیں گے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو سود نہیں کھائے گا اس تک اس کا دھواں ضرور پہونچے گا۔ (۲)

ہر سودی تہذیب کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ سود بیع کی طرح ہے، اور اس فاسد عقیدہ کی وجہ سے اس کی تجارت سودی معاملات سے اس طرح خلط ملط ہوتی ہے جیسے خون گوشت کے ساتھ اور روح جسم کے ساتھ کہ ان دونوں کا الگ کرنا مشکل ہے، اس عقیدہ کے برخلاف اسلام نے دوسرا عقیدہ پیش کیا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (۳)

اللہ تعالیٰ نے اس ربانی اسلوب کے ذریعہ لوگوں کو ایک خاص حقیقت کی جانب متوجہ کیا ہے، وہ حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کا حلال ہونا، اور حرام ہونا یہ اصلاً اللہ کی مشیت اور اس کے ارادہ پر منحصر ہے، اور کسی حکیم کا کوئی کام کسی حکمت اور مصلحت سے خالی نہیں ہوتا تو اللہ کے احکام اس سے کیسے خالی ہوں گے، اس لئے حرام اشیاء کی تہہ میں فرد و جماعت کے لئے بڑے نقصانات اور معاشرہ و ماحول کے لئے بڑے خطرات پوشیدہ ہوتے ہیں، قرآن نے مامورات اور منہیات کے مصالح کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، لیکن یہ اشارہ اکثر صریح حکم

---

(۱) سورہ نجم: ۳-۴ (۲) مسند احمد (۳) سورہ بقرہ: ۲۷۵

نازل ہونے سے پہلے ہوتا ہے، تاکہ کمزور اور ناپختہ ذہن کے لئے یہ اطمینان کا باعث ہو، اور یہی اسلوب کسی حکم کو ذہنوں میں بٹھانے کے لئے زیادہ مفید ہوتا ہے۔

سب سے پہلے سود کی حرمت سے متعلق مکہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔

'وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَکٰوۃٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْہَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُضْعِفُوْنَ'(۱)

پھر مدینہ میں اس سے متعلق یہ آیت اتری:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَاتَاْکُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافاً مُّضٰعَفَۃً وَّاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔(۲)

پھر اس کے بعد سورۂ بقرہ کی یہ آیتیں نازل ہوئیں:

اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ، ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا، وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا، فَمَنْ جَآءَہٗ مَوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّہٖ، فَانْتَھٰی فَلَہٗ مَا سَلَفَ وَاَمْرُہٗٓ اِلَی اللّٰہِ، وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ، ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ۔ یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ، وَاللّٰہُ لَایُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیْمٍ۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ لَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَلَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ، وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَکُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِکُمْ لَاتَظْلِمُوْنَ وَلَاتُظْلَمُوْنَ۔ وَاِنْ کَانَ ذُوْ عُسْرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیْسَرَۃٍ، وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌلَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (۳)

---

(۱) سورہ روم: ۳۹ (۲) آل عمران: ۱۳۰ (۳) سورہ بقرہ: ۲۷۵-۲۸۰

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ نزول کے اعتبار سے یہ سب سے آخری آیتیں ہیں، اور یہ آپ ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے سے تین ماہ قبل نازل ہوئیں، امام بخاریؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ پر سب سے آخری آیت سود سے متعلق نازل ہوئی۔(۱)

اس طرح اسلام نے سود اور سود کھانے والوں کے خلاف کھلی جنگ چھیڑ دی، جو لوگوں کا مال باطل طریقہ سے کھاتے ہیں، غریبوں کی غربت، ان کی عاجزی اور مال کی ضرورت سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں، پھر سود لینے والوں کو اس شخص کے مشابہ قرار دیا گیا جسے شیطان نے چھولیا ہو۔ پھر اسے جنون لاحق ہو گیا، جس کی وجہ سے وہ نفع ونقصان کے درمیان فرق کرنے سے عاجز ہو جائے کیوں کہ وہ اپنی عقل اور فہم کھو چکا ہے، اس لئے ہر عقلمند کے لئے ضروری ہے کہ سود کے دلدل میں پھنسنے سے بچے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بیع اور سود کے درمیان فرق کو بیان کیا کہ پہلا حلال ہے اور دوسرا حرام "أَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وحرّمَ الرِبٰوا"، اور جو سودی لین دین کرے اسے جنگ کی دھمکی دی گئی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا "فأذنوا بحرب من الله ورسوله" اور بتا دیا گیا کہ وہ جہنمی ہوگا، ارشاد فرمایا: "ومن عاد فاولئك أصحاب النار هم فيها خالدون" (۲)

پھر مزید ارشاد ہوا کہ اللہ تعالیٰ سود کو کم کرتا ہے، مٹاتا ہے اور صدقہ کو بڑھاتا ہے، "يمحق الله الربا ويربى الصدقات" (۳)

مسلمانوں کو پوری صراحت اور تاکید کے ساتھ سود اور اس کے شائبہ سے بھی بچنے کا حکم دیا اور مکرر بتایا کہ ان کے لئے اصل پونجی ہے، نہ وہ خود ظلم کریں اور نہ ہی قرض خواہ کو پریشان کریں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ان قرض دینے والوں سے متعلق ارشاد فرمایا کہ مروت اور انسانی

---

(۱) تفسیر فتح القدیر، از شوکانی، ج ۱، ص: ۱۶۷ (۲) سورہ بقرہ: ۲۷۵ (۳) سورہ بقرہ: ۲۷۶

ہمدردی یہ ہے کہ جب قرض دار تنگدست ہو، فی الحال قرض ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو اسے مہلت دی جائے تا کہ وہ قرض کو ادا کر کے بری الذمہ ہو جائے، اس مہلت دینے اور چھوٹ دینے پر بھی مال والوں کے لئے اللہ نے ثواب کا وعدہ کیا ہے۔ اس کے بعد ان تعلیمات کا اختتام یہ کہتے ہوئے کیا گیا کہ تم لوگ اس دن کو نہ بھولو جب صرف اللہ کی ہی حکومت ہوگی، سارے لوگ اپنی بادشاہت، مال واسباب، اعوان ومددگار چھوڑ کر ان کے دربار میں حاضر ہوں گے، اس وقت انسانوں کی مالداری اوران کا غنی کوئی فائدہ نہیں دے گی۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سود دینے والے اور لینے والے پر، اس کو لکھنے والے اور اس کے دونوں گواہوں پر لعنت فرمائی، پھر آپ ﷺ نے فرمایا یہ سب لعنت میں برابر ہیں۔ (۱)

اور حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سود کے تہتر درجے ہیں، ان میں سب سے ہلکا درجہ یہ ہے کہ آدمی اپنی ماں سے تعلق قائم کرے اور سب سے بڑا سود کسی مسلمان کی عزت سے کھیلنا ہے۔ (۲)

سود دیگر مذاہب میں:

انسانی زندگی میں سود کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو معاشرہ انسانی خواہشات کے تابع اور آسمانی تعلیمات سے محروم رہے ہیں ان میں سود کا رواج ہمیشہ رہا، البتہ سارے آسمانی مذاہب نے سود کو حرام قرار دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اگر تم صدقات کو ظاہر کردو جب بھی اچھی بات ہے، اور اگر انہیں چھپاؤ اور فقیروں کو دو جب تو یہ تمہارے حق میں اور بہتر ہے اور اللہ تم سے تمہارے کچھ گناہ بھی دور کردے گا، اور تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے، ان کی ہدایت آپ کے ذمہ نہیں بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت

---

(۱) مسلم (۲) مستدرک حاکم

دیتا ہے، اور تم جو کچھ بھی مال میں سے خرچ کرتے ہو سو اپنے لئے کرتے ہو، اور تم اللہ ہی کی رضا جوئی کے لئے خرچ کرتے ہو، اور تم مال میں سے جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو سب تم کو پورا پورا لوٹا دیا جائے گا، اور تم پر ذرا بھی زیادتی نہیں کی جائے گی، اصل حق ان حاجتمندوں کے لئے جو اللہ کی راہ میں گھِر گئے ہیں، ملک میں کہیں چل پھر نہیں سکتے، ناواقف انہیں غنی خیال کرتا ہے، ان کی احتیاط سوال کا باعث، تو انہیں ان کے بشریٰ سے ہی پہچان لے گا، وہ لوگوں سے لگ لپٹ کر نہیں مانگتے اور تم مال میں سے جو کچھ خرچ کرتے ہو اللہ اس کا خوب جاننے والا ہے، جو لوگ اپنا مال رات اور دن اور پوشیدہ و آشکارہ خرچ کرتے رہتے ہیں سو ان لوگوں کے لئے ان کے پروردگار کے پاس اجر ہے، نہ ان کے لئے کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ جو لوگ سود کھاتے رہتے ہیں وہ لوگ نہ کھڑے ہو سکیں گے سوا اس کے جیسے وہ کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے جنون سے خبطی بنا دیا ہو۔ یہ سزا اس کے لئے اس لئے ہوگی کہ وہ کہتے ہیں کہ بیع بھی سود ہی کی طرح ہے، حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے، پھر جب کسی کو نصیحت اس کے پروردگار کی طرف سے پہنچ گئی اور وہ باز آ گیا تو جو کچھ پہلے ہو چکا وہ اس کا ہو چکا اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالہ رہا اور جو کوئی پھر عود کرے تو یہی لوگ دوزخ والے ہیں اور اس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے، اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے اور اللہ پسند نہیں کرتا کسی کٹے کافر گنہگار کو۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے اور نماز کی پابندی کی اور زکوٰۃ دی ان کے لئے ان کا اجر ان کے پروردگار کے پاس ہے، نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اے ایمان والو! اللہ

سے ڈرو اور جو کچھ سود کا بقایہ ہے اسے چھوڑ دو، اگر تم ایمان والے ہو، لیکن تم نے ایسا نہ کیا تو خبردار ہو جاؤ جنگ کے لئے، اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے، اور اگر تم توبہ کر لو گے تو تمہارے اصل اموال تمہارے ہی ہیں، نہ تم کسی پر ظلم کرو گے اور نہ تم پر کسی کا ظلم ہوگا، اور اگر تنگ دست ہے تو اس کے لئے آسودہ حالی تک مہلت ہے اور اگر معاف کر دو تو تمہارے حق میں اور بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو"۔ (ترجمہ تفسیر ماجدی)

یورپ میں مسیحیت سے قبل یونانی اور رومی تہذیب کے دور میں سود پوری طرح پھیلا ہوا تھا، صرف ایک آدھ مرتبہ ہی اس کو روکنے کی کوشش ہوئی، اس میں بھی صرف سود کی بعض قسموں کو منع کیا گیا جو زیادہ سخت تھی تاکہ اس کی سختی کم ہو جائے اور لوگوں کے ذہنوں میں اس کے ناقابل برداشت ہونے کا احساس ختم کیا جاسکے، البتہ اس پر مکمل پابندی اس وقت لگائی گئی جبکہ یورپ نے مسیحیت کی تعلیمات کو قبول کر لیا، اس وقت سے طویل زمانہ تک سود کی حرمت باقی رہی۔

مسیحی مذہب نے باہم نصاریٰ اور دوسرے لوگوں دونوں کے درمیان سود کو قطعی حرام قرار دیا، لوقا کی انجیل میں ہے:

اگر تم ایسے لوگوں کو قرض دیتے ہو جن سے مال کی واپسی کی امید ہے تو اس میں تمہارا کیا احسان؟ گناہ گار بھی گنہگار کو قرض دیتا ہے، اور اس کے مثل وصول کرتا ہے، بلکہ تم لوگ دشمنوں سے محبت کرو، ان کے ساتھ احسان کرو، ان کو قرض دو، واپسی کی امید مت رکھو، پھر تمہارا اجر زیادہ ہوگا اور تم لوگ نیکوکار اور بلند و عظیم ذات کی اولاد میں سے ہو گے، بے شک وہ احسان جتانے والوں پر انعام نہیں کرتا۔ تمام گرجا گھر سود کی حرمت پر متفق ہیں، جب بعض سود لینے والے یہودیوں نے سودی فائدہ کو جائز قرار دیا تو یہ گرجا گھر والے بھڑک اٹھے، اس نے یہ پسند نہیں کیا اور نہ اس کی اجازت دی، ان

یہودیوں نے یہ صفائی دی کہ یہ فائدہ تنظیمی اخراجات کے لئے لئے جاتے ہیں، اس کے مطابق بعض مسیحیوں نے سود کے جائز ہونے کا فتویٰ دے بھی دیا مگر گرجا نے اس کی موافقت نہیں کی۔(۱)

یہودی مذہب میں بھی سود حرام تھا، محمد حافظ صبری لکھتے ہیں:

''یہود کے درمیان باہم سود مکمل حرام ہے، لہذا جو سود لے یا دے، وہ ملت یہود سے خارج ہے، ہر یہودی پر ضروری ہے کہ محتاجوں کو اپنا مال بطور قرض دے، غریبوں کی مدد کرے، پریشان حال کو سہارا دے، اور ان کی طرف مدد کا ہاتھ بڑھائے اور انہیں وہ ساری چیزیں فراہم کرے جن کی اسے ضرورت ہے، قرض کی واپسی کے لئے کوئی مدت متعین نہ کرے، اور نہ اپنے کام کے عوض نفع لے، قرض کے لئے ضرورت مند کا فقیر یا مسکین ہونا ضروری نہیں، بلکہ مالدار اگر کسی پریشانی میں ہے، یا کسی عذر کی وجہ سے اسے روپیہ کی ضرورت ہے تو اسے بھی قرض دیا جائے گا۔(۲)

سود فلاسفہ اور ماہرین معاشیات کی نظر میں:

انصاف پسند اور ذی علم فلاسفہ نے سود کی حرمت کا اعلان کیا ہے، اور اسے حصول مال کا غیر فطری اور نامناسب طریقہ قرار دیا ہے، مشہور فلاسفر ارسطو کہتے ہیں:

یہ ممکن ہے کہ زمین بناتات اگ آئے، جانور اپنی طرح کا بچہ جنے، مگر یہ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ درہم اور دینار دوسرا درہم اور دینار پیدا کرے، یہ بانجھ پیدا ہوا ہے، اور بانجھ ہی رہے گا۔(۳)

یورپ میں بھی سود کی حرمت طویل مدت تک باقی رہی، اگر کوئی سود کی حرمت کا انکار

---

(۱) الربا والفائدۃ، از علاء الدین خروفہ، ص:۴۶ (۲) المقارنات والمقابلات بین أحکام المرافعات والمعاملات والحدود فی شرع الیہود ونظائرہ من الشریعۃ الاسلامیۃ الغراء:۸۷۴ (۳) حوالہ سابق:۵۱

کرتا تو اس کی تکفیر کی جاتی، سود کے گناہ ہونے کا تصور ہر طبقہ میں پایا جاتا تھا، یہاں تک کہ شعراء اور ادباء بھی اپنے اشعار اور اپنے ادب میں سود اور اس کا استعمال کرنے والوں پر طنز کرتے تھے، اس کی ایک مثال یہ ہے کہ شیکسپیئر نے اپنے ایک ڈرامہ میں ایک یہودی سود خور کی تمثیل پیش کی ہے، جو بڑی سختی کے ساتھ اور جارحانہ انداز میں قرض کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے، اس کو ایسے مؤثر اسلوب میں پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا سودی معاملہ کرنے والوں کو ناپسند کرنے لگتا ہے۔

بہرحال آسمانی مذاہب کی تعلیمات اور اخلاقی مذاہب کے احکام سب صراحت کے ساتھ سود کی حرمت پر متفق ہیں، اسلام نے تو سودی معاملہ کرنے والوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر رکھا ہے، اس کے باوجود سودی نظام موجودہ تہذیب کے ڈھانچہ کی بنیاد اور اساس بن چکا ہے، مغرب کو نہ مذہبی تعلیمات کی پرواہ ہے اور نہ اخلاق اور بلند اقدار کی فکر، اسی لئے اس نے اپنی تہذیب کے بلند آشیانہ کی تعمیر اسی سودی نظام پر کی ہے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے تمام گوشوں میں یوروپی اقوام کا رشتہ اخلاقی مذاہب اور آسمانی مذاہب سے کٹ چکا ہے، صرف بعض دینی رسوم کی ادائیگی کی حد تک مذہب سے وابستہ ہیں، جن میں نہ زندگی ہے اور نہ تازگی۔

اس سلسلہ میں افسوسناک بات یہ ہے کہ مغربی دنیا کی مادی ترقی اور اس کی چمک دمک سے ترقی یافتہ ممالک کے لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہیں، جس کی وجہ سے یہ لوگ بھی دین سے متعلق کے دعویٰ کے باوجود سودی نظام کی طرف لپک چکے ہیں اور انہوں نے اپنے اقتصادی نظام میں سود کو مرکزی حیثیت دے رکھی ہے، یہ حقیقت سے ناواقف ہیں کہ مغرب کی ترقی کا راز ان کی بڑی بڑی صنعتیں اور وسیع تجارت ہے، اور یہ سب تیسری دنیا اور نوآبادیات ممالک سے چھینی ہوئی دولت اور مغلوب اقوام کے معاشی وسائل پر قبضہ قائم ہے۔

مگر اب معاملہ اس سے آگے جا چکا ہے، خباثت آشکارا ہو چکی ہے، مغربی ممالک

خود اقتصادی بحران کا شکار ہونے لگے ہیں، اس اقتصادی نظام نے بڑے خطرات پیدا کردیے ہیں، یہ اپنے وسائل اور بازار پر انحصار کرنے کی وجہ سے ہے، سود کا ہولناک سایہ تہذیب پر بھی پڑنے لگا ہے، اور وہ دن دور نہیں جب سود کا اژدھا اس کے اقتصادیات کو نگل لے گا، اسی سودی نظام کے غلط اثرات ان ممالک میں ظاہر ہونے شروع ہوگئے ہیں جو ہر معاملہ میں اس نظام کی اتباع کو ضروری سمجھتے ہیں اور اس روش پر قائم ہیں۔

ہندوستان جیسا سرسبز وشاداب اور پیداوار ملک اس کی ایک مثال ہے، جو اپنی پوری آمدنی کا آدھا حصہ صرف سودی قرض کی ادائیگی میں صرف کرتا ہے، یہ قرض اتنا زیادہ ہے کہ طویل عرصہ میں بھی اس کی ادائیگی مشکل ہے، بلکہ اب سود کا ادا کرنا بھی مشکل نظر آنے لگا ہے، اور اس کے لئے بھی مزید قرض لینے کی نوبت آجاتی ہے، یہ صرف ہندوستان کی حالت نہیں ہے، بلکہ اکثر ترقی پذیر ممالک کا یہی حال ہے۔

سود کے برے اثرات میں سے یہ بھی ہے کہ مالدار ممالک جو بینکوں میں جمع شدہ رقم پر سود حاصل کرتی تھی، اب خود قرض کے لئے پریشان ہیں، اور سود کا سایہ اس کی اقتصادیات پر پڑنے لگا ہے۔

الغرض دنیا میں رائج سودی نظام کی وجہ سے پوری دنیا مختلف مشکلات اور پیچیدہ بحران کا شکار ہے، وجہ ظاہر ہے کہ ان ممالک کو ملک کی ترقی کے لئے جب سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے تو سودی قرض لیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح اپنی ضروریات پوری کر کے نفع حاصل کرنا زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس خسارہ کے جو سود کی ادائیگی سے لاحق ہوگا، شروع میں اس وقتی نفع سے اچھا نتیجہ سامنے آتا ہے لیکن دھیرے دھیرے یہ ملک کو انحطاط اور زوال کے دہانہ تک پہنچا دیتا ہے، تاریخ گواہ ہے کہ بہت سے ممالک نے سود کی وجہ سے اپنی عزت گنوائی ہے۔

عثمانی خلافت کے زوال کا حادثہ بھی قرض کے بوجھ کی وجہ سے پیش آیا۔ اسی طرح

متعدد ممالک سود کی وجہ سے مالدار ممالک کی غلامی میں چلے گئے۔اس کے مالی مشکلات اور اقتصادی بحران قرض اور بطور خاص سودی قرض سے حل نہیں ہو سکتے، البتہ آمدنی اور پیداوار کے مطابق خرچ میں اعتدال اور توازن قائم کرنے سے یہ مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

سودی معاملہ کرنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ سے ڈریں، اللہ کے عذاب کا خوف کریں، سود اور سودی معاملہ کرنے والوں سے متعلق قرآن وحدیث میں جو باتیں آئی ہیں مثلاً انذار، جنگ کی دھمکی، آخرت میں شدید عذاب وغیرہ ان کو اپنے سامنے رکھیں، اللہ اور رسولؐ پر ایمان لانے والوں کو چاہئے کہ تنگی کو ترجیح دیں، خوشحال اور راحت وآرام کی زندگی کے بجائے سادہ زندگی کو اختیار کریں، سود کے قریب بھی مت جائیں، بلکہ اس کے شائبہ سے بھی بچنے کی کوشش کریں۔

اسلامی شریعت میں ہر زمانہ کا ساتھ دینے کی صلاحیت ہے، وہ ہر علاقہ کے لئے مناسب ہے، وہ پورے معاشرہ کی بھلائی چاہتا ہے، وہ صرف تنگدستوں کے لئے نہیں ہے، اور نہ صرف مالداروں کے لئے ہے، وہ ایک جماعت کو دوسری جماعت پر سرکشی کی اجازت نہیں دیتا بلکہ وہ پورے معاشرہ میں پاکیزگی، محبت، ہمدردی اور سلامتی کو فروغ دینا چاہتا ہے، اس لئے اس نے یہ طریقہ رکھا کہ مال جمع نہ رہے۔ارشاد فرمایا گیا: 'لایکون دولة بين الأغنياء منكم' (۱) اس لئے اس نے سود کو حرام قرار دیا، اس لئے کہ اکثر اس سے ظلم کا دروازہ کھلتا ہے، باطنی امراض پیدا ہوتے ہیں، آسمان وزمین کا خالق اس سے بخوبی واقف ہے کہ انسان کے لئے نفع مند کیا ہے اور کون سی چیز اس کے لئے بہتر ہو سکتی ہے۔

غیر سودی اسلامی نظام جس کی بنا زکوۃ اور ضرورت مند اور کمزور کی مدد پر قائم ہے، وہ اجتماعی عدالت کو وجود میں لاتا ہے، مالدار کو محتاج سے محبت کا سبق سکھاتا ہے اور ایک کو دوسرے کی طرف متوجہ کرتا ہے، جبکہ سود فرد اور معاشرہ میں عداوت ودشمنی، بدامنی اور کینہ کے

---

(۱) سورۂ حشر: ۷

بیج بوتا ہے، تجارت اور اس کے منافع سود سے ہزار گنا بہتر ہیں کہ اس سے معاشرہ کی ضرورت پوری ہوتی ہے، اور انسانی زندگی سعادت سے ہمکنار ہوتی ہے۔

قرض کے تئیں ہمدردی، شفقت اور مروّت وانسانیت کے جذبات ہو چاہیئے، نہ کہ وقتی مادی فائدہ، سود کی بیماری کا سب سے بہتر علاج یہ ہے کہ قرض حسنہ اور مضاربت کی حوصلہ افزائی کی جائے، اگر حکوت قرض حسنہ دینے لگے اور مضاربت اور تعاون کے لئے ادارے قائم کرے تو لوگوں کو سودی قرض لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی، اس وقت دنیا کھلی آنکھوں اسلامی برکات کا مشاہدہ کرے گی، اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا: 'وما اتیتم من زکوة تریدون وجه الله فاولئك هم المضعفون' (۱)

سود سے قرآن میں جس طرح ڈرایا گیا اور جس انداز سے اس کی شناعت بیان کی گئی ہے، اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے جس صراحت کے ساتھ اس سے منع فرمایا اور اس کے حرام ہونے کو بتایا، یہ ساری باتیں اس کی متقاضی ہیں کہ مومن ہر حال میں اس سے اجتناب کرے اور اس حرام شی سے بچے۔ لیکن ایسے انسانی معاشرے جو مغربی تہذیب کی گود میں پلتے ہیں، جہاں سودی معاملات جاری وساری ہے وہ افسوس کے قابل ہیں کہ اسی تہذیب نے ایسے حالات پیدا کردیے ہیں کہ انسان کا سودی معاملہ سے خود کو الگ رکھنا مشکل ہے، مالدار کے لئے ایسے حالات ہیں کہ وہ اپنا سرمایہ بینک میں رکھنے پر مجبور ہے۔ اور محتاج کو قرض کا ضرورت مند بنادیا گیا، جب حالات ایسے ہوں اور حکومت بھی ایسی نہ ہو جو اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات کی پابند ہو، اس وقت مسلمانوں کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ پوری سنجیدگی کے ساتھ باہمی تعاون کا کوئی نظام بنائیں۔ اس مقصد کے لئے مستقل مالی ادارے قائم کیے جائیں، جس کی بنیاد غیر سودی معاملات پر ہو اور جب تک ایسا نہیں کرسکتے، اس وقت تک بینک کی خدمات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، مگر اس سے ملنے والا سود استعمال نہیں

---

(۱) سورہ روم: ۳۹

کریں گے، اگر بینک سے یہ سود از خود ملتا ہے تو اس سے ایسے مسلمانوں کی ضرورت پوری کریں جو اضطرار کی حالت کو پہنچ چکے ہیں کہ اضطرار میں ایسی چیز بھی جائز ہو جاتی ہے جو دوسری حالت میں جائز نہیں ہوتی۔ عالم اسلام کے مختلف گوشوں میں بہت سے صاحب ثروت مسلمانوں نے اس کے مطابق عمل شروع کر دیا ہے۔

اسی طرح ذی اثر اور صاحب ثروت مسلمان پر ضروری ہے کہ جن لوگوں کو مال یا قرض کی ضرورت ہے، ان کی ضرورتوں کو زکوۃ وصدقات کے نظام اور رفاہی وفلاحی کاموں سے پوری کریں، انہیں آخرت میں اس کا اجر ملے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضاً حَسَناً يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْلَكُمْ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ (۱)

مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، اس لئے ان پر ضروری ہے کہ دوسرے بھائی کا تعاون کریں۔

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "واللہ فی عون العبد ما کان العبد فی عون أخیہ" اللہ اس وقت تک بندے کی مدد کرتا رہتا ہے، جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں بحیثیت فرد اور بحیثیت جماعت اپنی مرضیات پر چلنے اور اپنے احکام پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، خواہ اس سے دنیاوی نقصان پہنچے، کیوں کہ دنیاوی خسارہ آخرت کے نقصان سے بہتر ہے۔

واللہ الموفق ولا حول ولا قوۃ إلّا باللہ

---

(۱) سورہ تغابن: ۱۷

اسلامی شریعت پر عمل ہندوستان میں

اللہ رب العالمین نے اپنے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کے ذریعہ ہم انسانوں کو جو شریعت عطا فرمائی، اس میں انسانوں کی زندگی کی واقعی ضرورتوں اور تقاضوں کا پورا لحاظ رکھا، اور اس کو آنے والے زمانوں اور دنیا کے مختلف علاقوں کے لحاظ سے بھی قابل عمل بنایا، اسی لیے اس شریعت کو زندگی کے صرف عبادتی پہلو تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اس میں زندگی کے تمام پہلوؤں اور انسانی تقاضوں کی رعایت رکھی، اسی کے ساتھ اس کو انسان کی خودغرضی اور نفسانی خواہشات کو کنٹرول کرنے والا بنایا، تاکہ انسان اس زمین پر ایک دوسرے کے ساتھ آپسی میل جول اور خیر پسندی کے ساتھ زندگی گزار سکے، اور اس پر عمل کرنے میں ایسی سہولت رکھی کہ مختلف انسانی حالات میں وہ قابل عمل ہو، چنانچہ گزشتہ چودہ سو سال کے دوران انسانی زندگی پر جو مختلف دور گزرے ان میں اسلامی شریعت پر عمل کرنے میں کوئی دشواری یا پریشانی پیش نہیں آئی، اس شریعت کو ماننے اور اس پر چلنے والوں کو حکومت کی ذمہ داریوں سے بھی گزرنا ہوا، اور کبھی اکثریت میں اور طاقت میں ہونے کے حالات سے اور کبھی اقلیت میں ہونے اور کمزور ہونے کے حالات سے گزرنا ہوا، کبھی ناخواندہ معاشرہ کا بھی حصہ بنے اور تعلیم یافتہ ماحول بلکہ علوم وفنون کی سرپرست کرنے کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کا بھی موقع ملا، ان سب حالات میں اسلامی شریعت پر عمل کرنے اور اس کو زندگی کے مختلف پہلوؤں میں جاری وساری رکھنے میں دشواری نہیں ہوئی، اس شریعت کو اقتدار کے شخصی دور میں بھی دشواری نہیں ہوئی اور اب دنیا میں جمہوری نظام کے عام ہوجانے پر بھی دشواری نہیں، بلکہ یہ صورت حال خاصی حد تک سازگار ہے۔

اس شریعت کی یہ وہ بڑی خوبی ہے جس کی بناء پر ہر زمانہ اور ہر معاشرہ میں اس پر عملدرآمد آسان رہا ہے اور اس کی تلقین کی جاتی رہی ہے، اور چونکہ یہ شریعت انسانوں کی بنائی ہوئی نہیں ہے، بلکہ اس ارض وسماء اور اس کی مخلوقات کے خالق اللہ رب العزت کی

طرف سے مقرر کردہ ہے اور وہ انسان کی طاقت عمل اور ضرورت کو سب سے زیادہ جانتا ہے، اس لئے یہ قانون شریعت انسان کی فطرت کے بالکل مطابق ہے، اسی لئے دین اسلام کو ''دین فطرت'' سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، اور چونکہ یہ شریعت اسی ذات اعلیٰ واجل کی مقرر کردہ ہے اس لئے اس کی مخلوق میں سے کسی کو بھی اس میں کسی ترمیم وتغییر کا حق نہیں ہے، اس کو اسی طرح عمل میں لانا ہوگا جس طرح وہ مقرر کی گئی ہے، اور اس ذات مقدس خالق انس وجن نے اپنے بندوں پر یہ لازم کردیا کہ وہ اپنی زندگیوں میں اس کی پابندی کریں اور اپنے کردار اور طریقۂ زندگی میں اس کے خلاف نہ جائیں، قرآن مجید میں فرمایا

''فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ، ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَيْتَ، وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْماً''(۱)

ترجمہ: سنئے، توجہ کیجئے قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ ایمان والے نہ ہوں گے جب تک ان میں یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں یہ لوگ آپ سے تصفیہ کراویں، پھر آپ اس کے تصفیہ سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں، اور پورے طور پر تسلیم کرلیں۔

شریعت اسلامی کی یہ اہمیت ہوتے ہوئے ہندوستان میں جب یہ بات سامنے آنے لگی کہ اس شریعت میں کسی طرح کے تغیر کا کوئی ارادہ پیش نظر لایا جارہا ہے تو مسلمانوں نے اس بات کو واضح کردیا کہ یہ صورت قابل قبول نہیں ہوسکتی، اور جب ہندوستانی دستور مسلمانوں کو اپنی شریعت یعنی مذہبی احکام پر عمل کرنے کی اجازت بھی دے چکا ہے تو اس کو روکنے یا کسی طرح کا تغیر کرنے کی کیسے اجازت دی جاسکتی ہے۔

مسلمانوں کی یہ امت زندہ اور تابندہ امت ہے، اس کو اپنی خصوصیات اور تشخصات کو برقرار رکھنے کی برابر فکر رکھنا ہے، اور احکام الٰہی کو پورے طور پر جاری اور قائم رکھنا ہے، اسی کے ذریعہ یہ امت رب العالمین کے دربار میں سرخرو اور کامیاب ہوگی، اور اپنے رسول مقبول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو روز قیمت مسرور وشادماں کرے گی۔

---

(۱) سورۃ النساء: ۶۵